حسن عابد

نیل گگن میں چاند کھلا تھا وہ تھا میرے پاس
چہرہ اُس کا چمک رہا تھا جیسے پھول کپاس

سوچ نگر

حسن عابد

مُرتّب	راحت سعید
طبعِ اوّل	جنوری ۱۹۸۰ء
سرورق	لیاقت حسین
کِتابت	محمد اسماعیل
مطبع	مشہور آفسٹ پریس، کراچی
ناشر	کارواں پبلی کیشنز
	۹/۱۶۶۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی
قیمت	عام ایڈیشن : بارہ روپے
	خاص ایڈیشن : اٹھارہ روپے

انتساب

گومتی اور سندھ کی

اُن دل نواز لہروں کے نام

جنہیں لوگ

آغا سہیل

راحت سعید

محمد علی صدیقی

اور

شارب لکھنوی

کے ناموں سے جانتے ہیں

نئے موسموں کا شاعر

حسن عابد کے مجموعۂ کلام ''سوچ نگر'' پر قلم اُٹھاتے ہوئے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے زندگی کی حسن افروز اور مبارزہ طلب جہتوں پر قلم اٹھانا ہی نقدِ شاعری کا وظیفہ ہو۔ حسن عابد، حسن، عشق، فکری بالیدگی اور ذہنی انقلاب کی ضرورتوں اور بدلے ہوئے حالات کے تناظر میں ان سب ابعاد کی از سرِ نو اہمیت اور مقام متعین کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ ایک عرصہ سے شعر کہہ رہے ہیں۔ کم و بیش ۲۲-۲۳ سال سے حسن عابد لکھنؤ یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ زندگی اور ادب کی بحثوں میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے اور اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے ہونے کی گواہی دیا کرتے تھے۔ وہ پروفیسر احتشام حسین مرحوم کے اُس حلقۂ تلامذہ (تکنیکی طور پر نہیں تو معنوی لحاظ سے) کے ایک فرد ہیں جس میں قاضی عبدالستار، شارب ردولوی، راہی معصوم رضا، شہاب جعفری، شارب لکھنوی، اقبال مجید، قمر رئیس، احمد جمال پاشا، آغا سہیل اور باقر مہدی سرِ فہرست تھے۔ وہ پاکستان کی جانب رُخ کرنے سے پہلے مجاز، جذبی اور اختر الایمان کی معیت میں متعدد آل انڈیا مشاعروں میں شرکت کر چکنے کے بعد جب ۱۹۵۷ء میں کراچی آئے تو اس شہر کے شور و غل اور ہمہ دم متغیر زندگی میں ایک واضح مفہوم تلاش کرنے کی تگ و دو میں شاعری کی دیوی سے بچھڑ گئے۔ لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ حسن عابد ادب کی قلمرو سے یکسر جلاوطن ہو گئے ہوں۔ وہ یونانی میتھالوجی کے ایک خیال انگیز کردار پروٹیئس (PROTEUS) کی طرح اپنی راکھ سے دوبارہ متشکل ہوئے۔ کم از کم دوسروں کو متشکل ہوتے ہوئے نظر آئے ہر چند کہ وہ وہی تھے جو کہ تھے اور اگر کچھ واقعتاً ہوا تھا تو بس

اس قدر کہ حسنؔ عابد نے ۲۰ برس کے اس بن باس میں زندگی سے بہت کچھ سیکھا۔ زندگی عرفانِ وقت کا نام ہے۔ وقت بڑا جان لیوا ہے۔ سو زندگی بھی کم جان لیوا نہیں اور شاعر حضرات ہوں یا ادب کی دیگر اصناف کے حوالہ سے زندگی اور انسان کے رشتوں پر سوچنے اور لکھنے والے ہوں، ان سب کو ایک ہی قدرِ مشترک زندہ رکھتی ہے کہ یہ ادب کے مستقل بالذّات پیکروں کے ذریعہ ہمہ دم متغیّر زندگی کے بظاہر بے ربط غیر منطقی، پُراسرار اور بے مقصد سیلِ رواں میں اپنی قدم گاہوں اور اپنے زاویۂ نگاہ پر اصرار کرتے ہیں اور اس سچے اور کھرے مشن پر ثابت قدمی سے بار بار کا دُہرایا ہوا اور آزمایا ہوا سچ پھر دُہراتے ہیں کہ ادب زندگی کی نمو اور ارتقا کی تفہیم کا ایک ایسا قابلِ اعتبار آلہ ہے جو زندگی کی صورت میں یکسر تبدیلی کے باوجود بھی اپنے مخصوص زمان و مکان کے حوالوں سے انسان شناسی اور انسانی رشتوں میں تبدیلی کے عرفان سے متشکل ہونے والی اخلاقی اور جمالی قدروں کی تفہیم کے لیے ضروری حوالہ کا کام کرتا ہے۔ سیلِ وقت پر فنّی اظہار کی فتح اُسی وقت ممکن قرار دی جا سکتی ہے، جب فن کسی دوسرے ڈسپلن کا نعم البدل نہ رہتے ہوئے بھی، انسانی تاریخ کا وہ لمحہ دل گداز بن جائے جب دل کی دھڑکنیں اور ذہن کی ترنگیں اپنی دھڑکنوں اور ترنگوں کے شعور کے بارے میں شعوری نہ دکھائی دے رہی ہوں لیکن وہ پڑھنے والے کے اندرون میں ایک ایسی پُرسکون ہلچل پیدا کر دیں کہ فن حقیقتِ ثابتہ بن جائے اور وُہ سارے معروضی تلازمے جنھوں نے فن کو جنم دیا تھا ضروری رہتے ہوئے بھی غیر ضروری نظر آنے لگیں۔

حسنؔ عابد کی شاعری میں کیا کچھ نیا ہے اور کیا کچھ روایتی، اس کا فیصلہ میں صرف اپنی حد تک ہی کر سکتا ہوں۔ ہر قاری اپنی حد تک ہی فیصلہ کرتا ہے لیکن بعض فیصلوں میں تعمیم کی اس قدر گنجائش نکل آتی ہے کہ بہت سے قارئین کے یہاں کسی فن پارہ کے بارے میں بے خد و خال رائے، دوسرے قارئین کے کُلیہ سے ہم آہنگ ہو کر تفہیم کی ایک ایسی چنگاری میں بدل جاتی ہے، جس سے اِردگرد کے مناظر زیادہ منوّر ہو جاتے ہیں۔ اُس آگ

کی طرح جو روشنی کی ایک پتلی اور نحیف سی لکیر کی حیثیت سے اذنِ سفر لیتی ہے اور پھر جنگل کی آگ بن جاتی ہے۔ ذاتی آرا، شاید اسی وجہ سے اکثر اوقات خاصی اہم بن جاتی ہیں کہ وہ کلیہ کی منزل میں داخل ہو کر ایک "نامعلوم" بسیط اور ناآزمودہ منطقۂ خیال کو معلوم قابلِ ادراک اور پھر قابلِ حظ اندوزی بنا چھوڑتی ہیں۔

حسن عابد کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت مجھے مُعاً یوں لگا کہ یہ شاعری روایتی بھی ہے اور جدید بھی مجلسی بھی ہے اور کھُردری بھی، ادعائی بھی ہے اور اشاراتی بھی، استعاروں کی جانب سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور واضح اساطیر (MYTHS) کے سہارے علامتوں سے بھی ایجاز اور حسنِ بیان کا کام لیتی ہوئی ملتی ہے۔ یہ شاعری مجھے بہت سے جدید شاعروں کی شاعری جیسی لگی لیکن اس کے باوجود اس قدر مختلف بھی کہ یہ بیک وقت بہت سی سطحوں پر سفر کرتے پھیلتے سکڑتے خوبصورت رنگوں کی شاعری ہے۔ مجھے اس مجموعۂ کلام کے مُطالعہ کے دوران خوش رنگ آوازوں اور دلنشیں رنگوں کی ایک ایسی یورش نظر آئی کہ جیسے شاعر فیض کے تتبع میں مصحفی، سودا، یقین، غالب اور اقبال کے کوچوں سے گزرتے ہوئے سوئن برن کی پناہ گاہ میں ٹھہرنے کے بجائے لورکا اور نیرودا کی دلنشیں پناہ گاہوں کی جانب مڑنا چاہ رہا ہو۔ فیض اور راشد قدما کے کوچہ سے گزرتے ہوئے جدید حسیت کے نبّاض مغربی شعرا کی جانب مڑ گئے تھے۔ اوّل الذکر نے لیر مونتوف، لورکا، نیرودا اور مادکوفسکی سے اس قدر حاصل کیا ہے اور اُسے کامیابی کے ساتھ اردو شاعری کے مزاج میں ڈھالا ہے کہ اُن کی شاعری کے ٹھہراؤ ہی سے اخذ و اکتساب کی ہمہ جہتی اور نظامِ ہضم کی اعلیٰ کارکردگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ فراق بھی بہت سے مغربی شعرا سے متاثر ہیں، لیکن انھوں نے ہندی رس سے بھی استفادہ کیا ہے اور خود کو غزل کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ راشد رومانیت کے سیکولر اور مذہب بیزار رویہ پر گامزن ہو کر اظہار کی بلندیوں کے اُن پیکروں کے اسیر ہو گئے جو پاؤنڈ، ایلیٹ اور والس اسٹیونس کی جانب جاتے ہیں۔ اختر الایمان کا شعری سفر بھی قدرے مختلف اسلوب اور زاویۂ نگاہ کے ساتھ کربِ ذات کی گرہ کشائی کا سفر ہے اور عام شعری زبان میں جو فیض کے گنگناتے لہجہ یا راشد

کی گرج چمک کے بجائے خود کلامی کا لہجہ لئے ہوئے ہے۔ قاسمی کا شعری رویہ قدرے مختلف ہے۔ وہ اپنی شاعری کی منزل اور مقصود سے کبھی غافل نہیں ہوتے اور وہ اپنے شعری سفر میں غیر ملکی شعرائے سے اس درجہ متاثر نہیں ہوئے کہ ان کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے غیر ملکی شعراء کا ذکر ضروری ہو۔ وہ روایت اور درایت کے شاعر ہیں۔ سردار جعفری نے جوش کے آہنگ کو سماجی انقلاب کا لہجہ دیا۔ قاسمی اور سردار جعفری اقبال اور جوش ملیح آبادی کی معجز نگاری کے سائے سائے پروان چڑھے۔ البتہ فیض اور راشد کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے یہاں جوش، اقبال اور اختر شیرانی کے شعری رویہ کے واضح ارتسامات نظر آتے ہیں۔ مجاز اپنے رنگ کے واحد شاعر ہیں اور جواں مرگی کے باوجود وُہ افقِ شاعری پر ابھی تک تابندہ ہیں۔

حسن عابد کے مجموعۂ کلام کے ضمن میں متذکرہ بالا شعرائے کے بارے میں گفتگو ضمنی طور پر ہی سہی لیکن اس لئے ضروری ہے کہ اس نے متذکرہ بالا اور بہت سے دیگر ہم عصر شعراء کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور وہ اِن سب کے مخصوص رنگ اور شعری رویہ کے بارے میں رائے رکھتا ہے۔

یہی ایک حقیقت کہ وُہ اس قدر خوب صورت، دھنک رنگ روشنیوں کے بیچ میں اپنی مخصوص روشنی اور اپنی "مَیں" پر اصرار کر رہا ہے۔ ہر شاعر اور ادیب کی علیحدہ علیحدہ "مَیں" کا جواز ہے۔ ہر دور میں بہت سے شعراء اور ادیب بیک وقت لکھتے آتے ہیں، لکھ رہے ہیں اور لکھتے چلے جائیں گے، چونکہ ان میں ہر فرد اپنی حقیقی "مَیں" اور فنی اظہار کی "مَیں" کے مابین کامل اتصال کا خواہاں ہوتا ہے اور یہ وہ دوڑ ہے جس کے بارے میں التباسات (ILLUSIONS) کی پرورش کی جاتی ہے۔ ورنہ بھیانک حقیقت تو یہی ہے کہ شعراء کی غالب اکثریت ان دونوں "مَیں" کے مابین کامل اتصال سے محروم رہتی ہے۔ حسن عابد کے بارے میں یہ حکم لگانا کہ یہ وُہ خوش قسمت شخص ہے جس نے یہ معرکہ سر کر لیا ہے قبل از وقت ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ غالباً بہت زیادہ غلط نہیں ہے کہ حسن عابد قدرے مختلف شاعر ہے اس قدر مانوس اور اجنبی کہ بس الامان۔ وُہ اپنی فکر کے حوالہ سے مانوس اور اپنی ذات کے حوالہ سے اجنبی اجنبی سا لگتا ہے۔ یہ وہ شاعر ہے جو شاید خود پر بھی منکشف ہونے سے ڈرتا ہے۔ اس لئے اچھی اچھی باتیں سوچتا ہے۔

حسنؔ عابد کی زندگی زخم ہی زخم ہے، اُس نے شاید زخموں کے دفور ہی سے بیدم ہو کر انھیں "پھول" سمجھنے کی خُو اپنائی ہے۔ روایت کے تتبع میں نہیں، بلکہ شاید اختیاری فیصلہ کے طور پر ہماری زندگی تناقضات سے بھری ہوئی زندگی، دیدۂ بینا پیدا ہو کر اُسے بھی زخم بنا چھوڑتی ہے۔ حسنؔ عابد کی شاعری میں زندگی زخم اور بہار و خزاں اس تواتر سے ضبطِ تحریر میں آئے ہیں کہ شاید اُنکی خامہ فرسائی یادوں کی زخم نویسی کے باوجود اپنے آدرشوں کے ساتھ سرمستی کا ایک نغمہ ریز رویہ بن کر رہ گئی ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔

وہی ہے دستِ نمک پاش و دستِ چارہ گر — میں زخم زخم سہی حالِ دل دکھاؤں کیا

یاد آئے تو میری آنکھوں میں — اشک بن بن کے بھر گئے وُہ دن

لے گئے نیند اُڑا کے آنکھوں سے — ہم کو بے خواب کر گئے وُہ دن

میلاد ہو کہ مجلسِ غم مُبتلا ترے — آنگن میں دل کے فرش بچھائے ہوئے تو ہیں

شوقِ وصال تھا بہت سو ہے وصال ہی وصال — ہجر کے رنگ اب کہاں موسمِ غم بدل گئے

ترے جمال نے روشن کیا چراغِ نظر — کہ جگمگانے لگے ہیں تمام ویرانے

ہم تھے اور تم تھے پر گئے وُہ دن — اچھے دن تھے، گذر گئے وُہ دن

جو ہماری بہار کے دن تھے — بے حکایت گزر گئے وُہ دن

دستِ دراز چاہیئے حاصل کے واسطے — سب راہ کے شجر ہیں پھلوں سے لدے ہوئے

سائے ہوئے ہیں جمع درختوں کے آس پاس — آئیں گے کوئی روز مُسافر تھکے ہوئے

اور پھر ذرا اس کے بعد ایک اور کیفیتِ حال و قال کی جانب نظر دوڑایئے:۔

مَیں کیوں آیا تمھاری زندگی میں — کبھی تم نے مجھے سوچا تو ہو گا

میں تم سے کیا کہوں دل کی تمنّا — تمہارا دل بھی کچھ کہتا تو ہو گا

بات جو اُس گُلِ رنگین میں ہے اوروں میں کہاں — یوں تو پروردۂ آغوشِ بہار اور بھی ہیں

اُس کے تمام رنگ تھے میری بہار گفتگو — اب جو نہیں وُہ رنگ پاس بات کریں تو کیا کریں

آئینۂ خیال میں عکس ہے ایک مُستقل — درد ہے اور دل کے پاس بات کریں تو کیا کریں
خود کو پانے کی جستجو ہے وُہی — اُس سے ملنے کی آرزو ہے وُہی

اور پھر یہ حال ہے کہ :-

خاک ہو بیٹھے اُس کے کوچہ میں — اے صبا اب ہمیں اٹھائیو مت
حیات قوسِ قزح ہے ہزار رنگوں کی — وہی نظر جو حقیقت کا رنگ پہچانے
حسُن دنیادار کہاں اور عشق سادہ لوح کہاں — ہم نے رفتہ رفتہ اس کو اپنے رنگ پہ ڈھالا ہے
تنہا تھے جب تو آنکھ کے آنسو بھی دل میں تھے — وُہ آ گیا تو ضبط کا یارا نہیں رہا

اب آپ اُن کے اشعار کے ایک اور انتخاب پر غور کریں :-

لبِ دوزی فنکاری ٹھہری کیسے دل احوال کہیں — جو موسم ہو نرگس بن کر دیکھیں اور بیمار رہیں
ابھی کچھ اور ہو برباد دنیا — ابھی چشمِ حقیقت نم نہیں ہے
چاہے بھی دل تو درد کی مُہلت کہاں سے لائیں — ہم تم سے ربطِ خاص کی فرصت کہاں سے لائیں
جو تیرے بازوؤں میں بھی بے چین ہی رہا — اس کے لئے سکون کی دولت کہاں سے لائیں
ہاں کُشتگانِ جرأتِ انکار ہم بھی ہیں — یوں ہے کہ اپنے عہد کا اقرار ہم بھی ہیں
اے زندگی کی دُھوپ میں تپتے ہوئے بدن — اس سمت آ کہ سایۂ دیوار ہم بھی ہیں
یہ داغ داغ چمک اٹھا گُل زخم زخم مہک اٹھا — غمِ یار تیری نگاہ نے مجھے دِل نواز بنا دیا

حسن عابد "لبِ دوزی فنکاری ٹھہری" اور "چشمِ حقیقت نم نہ ہونے کا" گریہ کرتے ہوئے اپنے قاری کے سامنے "ربطِ خاص کی فرصت" جیسے غیر روایتی جذبات ہی کی ضیافت کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ وہ فیض کے رقیب سے بھی ایک قدم آگے نکل کر یہ شعر کہتے ہوئے مِلتے ہیں:-

یہی چشم ولب یہی زُلف و رُخ کبھی ان پہ ایسی پھبن نہ تھی — ترے عاشقوں کی بہار ہو تجھے دیکھ کیسا سجا دیا

اور اگر دیکھا جائے تو حسن عابد کے یہاں اپنے "محبوب" کے عاشقوں سے خوش ہونے کا جذبہ اس قدر نیا ہے کہ روایت کا مفہوم ہی بدل کر رکھ دیا گیا ہے اور اس طرح کہ اُن کا محبوب وہ حقیقت بن چکا ہے جو سب ہی کے درد کا درماں ہے۔

مندرجہ بالا اشعار کے مُطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حسن عابد نے بات کہنے کے لئے نئے اور نرالے طریقے نکالے ہیں۔ جدّت پسندی کا یہی وہ مفہوم ہے جو روایت کے شجر میں نئے برگ و بار لاتا ہے اور اجنبی طرزِ احساس کے الزام سے بَری الذمّہ رہتا ہے۔

زندگی، ہمارے شاعر کے لئے، اپنے موڈز کے ساتھ وقت گزاری کا نام نہیں، بلکہ زندگی کا اثبات، اپنے جلو میں، تبدیلی اور تغیّر کی روشنی لاتا ہے۔ شاید اُسے اپنے نظریہ کی تازہ دمی اور معنویّت کا والہانہ طور پر شدید احساس ہے۔ لیکن اُس نے ایک اَمرِ سچائی کے اظہار کی خاطر بات کہنے کا کچھ ایسا ڈھنگ نکالا ہے جس سے روایت بھی ناآسودہ و دل گرفتہ نہیں ہوتی، اور جدّت پسندی پر صرف اُس گروہِ مغائرت نصیب کی اجارہ داری نظر نہیں آتی، جو جدّت پسنچی کی آڑ میں کہولت اور افسردگی بیچتا ہے۔ اپنے وجود ہی کو کائنات گردانتا ہے اگر اس گروہ کی "میں" "اجتماعی" "میں" سے ہم آہنگ نہیں ہے تو پھر کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟

حسن عابد نے اپنی نظم "کھاجا" میں مابعد تاثراتی تکنیک میں جدید علامت نگاری کا سہارا لیتے ہوئے اس قدر خوبصورت اظہار کیا ہے کہ یہ اظہار کی منزل سے گزرتے ہی ابلاغ بن جاتا ہے:

میں ایک ٹیلہ پر ایستادہ
برہنہ آنکھوں سے
ایک بڑھتا سیاہ جنگل سا دیکھتا ہوں
سیاہ شاخیں سیاہ بھالے
سیاہ بندوق کی صدائیں
میں سُن رہا ہوں
سیاہ نعرے جو گولیاں بن کے اُڑ رہے ہیں
میں دیکھتا ہوں
سیاہ ہاتھوں کی ضربِ پیہم
سیہ طبل کی صدائے دَم دَم

سیاہ جسموں کا رقصِ پیہم
جنونِ آدم
شعورِ برہم
سیہ زمین کے سیاہ ذرّے
فضا میں اُڑتے سیہ شرارے

آپ اس نظم میں 'سیاہ جنگل' سیاہ ہاتھوں' سیاہ جسموں سے گزرتے ہوئے جب سیاہ شراروں تک پہنچتے ہیں تو الفاظ اور رنگوں کے مابین سارے فرق مِٹ جاتے ہیں' ایک خوبصورت فریم میں شارپ وِل کے مقتولین کے 'سیاہ خون' کے تناظر میں ایک ایسا فن پارہ جنم لیتا ہے جو شاعر کو نئی بلندیاں بخشتا ہے۔ اس نظم میں بلا کی حرکت ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ہیئت کی حرکت' مواد کے اقتضا کا ساتھ دے پا رہی ہو لیکن اس نظم میں جو حرکت پائی جاتی ہے۔ محض سکوت وجمود کی متضاد کیفیت نہیں ہے بلکہ پورا منظر متحرک ہے' اپنی منزل کی طرف شاعر نہ صرف زبان وبیان کی موزونیت کے بارے میں محتاط اور حسّاس ہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ قاری پر اس نظم کی تفصیلات گہرائی اور پیغام سب ایک ساتھ عیاں ہوں۔

حسن عابد اپنی شاعری کے تجزیاتی مطالعہ کی جگہ' اُس کے کلّی مطالعہ کے طلب گار ہی نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے مضراب سے قارئین کے سازِ تفہیم کے صحیح تار چھیڑتے ہیں اور اس ہنر کی وجہ سے اپنے محبوب آدرشوں کو زیادہ اعتبار اور احترام بخشتے ہیں۔

میں اس مجموعے میں شامل کچھ اور نظموں کا بھی اجمالی طور پر ذکر کروں گا۔ "دو خواب"، "پیکار" "یہ خواب ہی تو نہیں"، "سوچ کا دھارا" "آرزو" "نقشِ کفِ پا" "خود تنقیدی" "سچا ایمان"، جدید ترقی پسند شاعری میں قابلِ فخر اضافے ہیں۔ یہ نظمیں ترقی پسند شاعری پر اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب بھی ہیں اور شاعری اور زندگی کے اَنمٹ رشتوں کے لازوال عہد نامہ کی چند سرخیاں بھی جو وقت وزمان کی قید میں رہتے ہوئے بھی وقت وزمان سے آزادی کے طالب ہیں شاید ہی کسی اور نئے شاعر نے ترقی پسند روایت اور فن کی حدود میں رہ کر آزادی اور جرأت

کا اس قدر انوکھا مظاہرہ کیا ہو۔

حسن عابد کا اولین مجموعۂ کلام جدید ترقی پسند ادب میں نئے ولولہ اور نئے جذبہ کے وفور کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگر نقطۂ نظر کی یکسانیت، اسلوبِ بیان اور شعری خیال تک کو یکساں بنا چھوڑے تو پھر حسن عابد جیسے شعراء کی ضرورت نہیں رہتی۔ حسن عابد شاید افقِ شاعری پر جلوہ گر ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ فن، اپنی غایت میں نادرہ جُو اور تازہ طلب ہے حقیقت کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ انسانی شرف اور عدل و انصاف کی بالادستی انسانی سرشت کا تقاضہ ہے اور اس لئے اِن اقدار پر اصرار "آؤٹ آف فیشن" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں اگر کوئی شاعر یا ادیب اپنے کربِ ذات کی فنی توجیہہ پیش کرنے کا اہل نہیں ہے اور وہ اپنی ناکامی کو کامیابی گردانتے کی سہل انگاری میں مبتلا ہے تو پھر شاعر یا ادیب کے لئے نظریہ کی بیساکھی بھی راس نہیں آتی، نظریہ اور فن کے درمیان ایک مہیب کھائی ہے جسے پار کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے والوں کے کتبے جا بجا نظر آتے ہیں۔ تو شاید حُسنِ کلام اور نظریاتی حُسن دونوں کے لئے ضروری ہے کہ معروض اور موضوع میں اتصال ہو، مجھے کچھ یوں لگتا ہے کہ حسن عابد کی شاعری حُسنِ کلام اور آدرشوں کی سنجیدہ اور متین محبتوں کی شاعری ہے اور انھوں نے اب تک جس آہستہ خرامی اور مستقل مزاجی سے اپنا سفر طے کیا ہے، اُس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جوشؔ، اقبالؔ، فیضؔ، قاسمیؔ، مخدومؔ، سردارؔ، مجازؔ اور اخترالایمانؔ کی روایت پر گامزن ایک تازہ دم شاعر عشق اور ایقان کی راہ کی بہت سی نئی بلندیاں سر کرے گا اور یہ اُردو شاعری کے لئے ایک نیک شگون ہے کہ اُس نے بالآخر ایک ایسے گوہرِ نادمیدہ کو پا لیا ہے جو بیس سال پہلے روشن امکان کی شکل میں موجود تھا اور آج ایک ایسی حقیقت بن چکا ہے جسے فن کے جوہری اور زندگی کے رسیا اپنے تکیوں کے نیچے اور دل کے قریب رکھیں گے۔

محمد علی صدیقی
۹ ستمبر ۱۹۷۹ء

کچھ باتیں

...... شعر کی طرف میلان میرے ماحول کی دین ہے۔ میری دادی جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتی تھیں، اپنے مذہبی جذبات کا اظہار شعروں میں کرتی تھیں اور جب بھی خاندان کا کوئی لڑکا ہاتھ آجاتا تو وہ اسے بٹھال کر اپنے اشعار لکھوالیتیں میرے والد مولانا سیّد محمد ساجدؔ شاعر تھے میرے ایک اور بزرگ سیّد ابو المظفر خنداںؔ جو نادمِ تحریر حیات ہیں، ایک اچھے شاعر ہیں۔

اِن بزرگوں کے علاوہ میرے دادھیال کا مجموعی ماحول بھی اچھا خاصا ادبی تھا۔ کئی خواتین شعر کہتیں اور اکثر یوں بھی ہوتا کہ گھریلو لڑائیاں شاعری کے ذریعے لڑی جاتیں جوشؔ اور اخترؔ شیرانی محبوب شعرا ہُوا کرتے جن کی نظمیں بیاضوں میں نقل کی جاتیں اور مزے لے لے کر پڑھی جاتیں۔ اس طرح ہم چھوٹوں کے ذہن بھی اِن نظموں کی رنگین پھواروں میں نہا گئے۔

میرے والد اقبالؔ کے بہت معترف تھے۔ انھوں نے مجھے بچپن ہی میں علّامہ کی کئی نظمیں یاد کرادی تھیں: ؏ آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

؏ از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز وغیرہ

ہوتا یوں کہ جب شام کو گھر کے آنگن میں پلنگ بچھائے جاتے اور میں لیٹتا تو سونے سے قبل والدِ مرحوم ان نظموں کو ضرور سنتے۔ روزانہ کے اس وظیفہ نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو، مگر مجھ میں ''آہنگ'' کا احساس ضرور پیدا کیا۔ چنانچہ جب مَیں نے پہلی غزل کہی اور اپنے محلّہ کے ایک بزرگ شاعر کو دکھائی تو انھیں دیر تک اس بات پر حیرت رہی کہ میرا کوئی شعر وزن سے خارج نہ تھا۔

مَیں چُھٹپن میں اپنے والد کی پیش خوانی کرتا اور اُن کی رُباعیاں اور اشعار پڑھتا اس کے علاوہ بھی وہ اکثر اپنی نظمیں اور منظوم خطوط مجھے سُناتے مختصر یہ کہ میرے یہاں شعر گوئی سے

دلچسپی میں کسی الہامی مہیج کا دخل یقیناً نہیں رہا اور دراصل ایسا کوئی مہیج ہوتا بھی نہیں۔

میں اپنے گھرانہ کو زمیندار گھرانہ نہیں کہوں گا۔ اگرچہ کچھ زمینیں اور باغات ہماری ملکیت ضرور تھے لیکن ہماری معیشت کا دارو مدار نوکری پر تھا۔ والدِ مرحوم جاگیرانہ طرزِ حیات سے سخت نفرت کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ مجھ سے جب بھی خفا ہوتے تو کہتے "میں تمھیں ایسی سزا دوں گا کہ تمھارے دماغ سے جاگیرداری بناٹا نکل جائے گا"۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا جب میں محنت سے جی چراتا یا کسی کام کو کسرِ شان سمجھ کر منہ بناتا۔ وہ محنت کی عظمت کے قائل تھے۔ ہر کام خود کرتے اور مجھے بھی ایسا ہی کرنے کی تلقین کرتے۔ ان کے نزدیک اسلام ایک انتہائی سادہ مذہب تھا جس میں جاگیرداری اور سرمایہ داری کی کوئی گنجائش نہ تھی اسی لیے وہ علمائے کرام کی عیش پسندانہ اور جاہ پرستانہ زندگی کے ناقد تھے اور ان میں پائے جانے والے تضادات کو واضح کرتے رہتے۔ انھوں نے مجھے کبھی کسی کتاب کو پڑھنے سے نہیں روکا۔ وہ کہتے تھے کہ آدمی کو مختلف نظریات رکھنے والی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ دراصل انھیں اپنے عقیدہ کی صحت پر اتنا یقین تھا کہ ان کے خیال میں ایک جویائے حق تمام دائروں میں چکر لگا کر بالآخر اُسی نقطہ پر واپس پہنچ جائے گا جو سچائی کا امین ہے۔

دُوسری شخصیت جس سے میرا ذہن متاثر ہوا وہ میرے چچا سید ابوالحسن سیف شادانی کی تھی۔ وہ تقسیم سے قبل بہ سلسلۂ تعلیم لاہور میں مقیم رہے۔ مولانا عبدالمجید سالکؔ، خوشتر گرامی اور اختر شیرانی وغیرہ سے اُن کے گہرے مراسم تھے۔ ان کا فارسی کا ذوق بہت نکھرا ہوا تھا۔ وہ ایک سادہ مزاج اور بے باک انسان تھے۔ ایک ایسے وقت جبکہ میرے والد سمیت سارے اہلِ خاندان مسلم لیگ کے حامی اور طرفدار تھے وہ واحد شخص تھے جو کھدر پوش اور نیشنلسٹ تھے۔ انھوں نے عملی طور پر سیاست میں حصہ لیا لیکن بعض مجبوریوں کے سبب یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ وہ سختی سے نماز کے پابند تھے اور اگر کبھی کسی ہندو دوست کے یہاں نماز کا وقت ہو جاتا تو اُسی سے پانی لے کر وضو کرتے اور وہیں نماز ادا کرتے۔ میرے والد کئی بار ان کے اس رویہ پر معترض

ہوئے مگر ہر بار وہ ہنس کر بات ٹال جاتے۔ دراصل وہ اچھے انسانوں کے درمیان کسی قسم کی
تفریق کے قائل نہ تھے۔ وہ خوش لحن بھی تھے اور آلاتِ موسیقی میں بانسری بجانے کے فن
سے بخوبی واقف تھے۔

بہرحال ماحول کی اس دھوپ چھاؤں سے گزرتا ہوا جب میں بہ سلسلۂ تعلیم لکھنؤ پہنچا
تو میرے موجودہ ذہن کے ابتدائی نقوش بہت غیر واضح نہیں تھے۔ مادرِ علمی لکھنؤ یونیورسٹی میں استادِ
محترم سید احتشام حسین کی شخصیت اور ان کی تحریروں نے میرے ذہن کو ایک واضح سمت عطا
کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

حصولِ تعلیم کے اسی دور میں وہ حلقۂ یاراں بنا اور اُن لوگوں سے ملاقات و تجدیدِ ملاقات
ہوئی جن کے ساتھ بسر کی ہوئی زندگی کی سرشاریوں اور فکر خیز لمحوں کی یاد دل کو اعتماد اور
حوصلہ کی آغوش سے جدا ہونے نہیں دیتی۔ ڈاکٹر قمر رئیس، احمد جمال پاشا، اقبال مجید، رتن
سنگھ، محسن زیدی، شارب لکھنوی، آغا سہیل، ڈاکٹر شارب ردولوی، سبطِ اختر، قاضی عبدالستار،
رام لعل، ڈاکٹر محمد حسن، عثمان غنی ہاشمی، منظر سلیم، مسیح الحسن رضوی، عابد سہیل، نجم الحسن، اقبال ندیم،
ذکی شیرازی، ڈاکٹر احراز نقوی، شوکت عمر اور شاہد رضوی وغیرہ ہم سبھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے
جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور بحث و مباحثہ کے دوران اکثر اپنے بزرگوں اور استادوں
کی آرا سے بلا جھجک اختلاف کرتے۔ انجمن کی اس جمہوری فضا نے تقریباً ہم سبھی کو بہت کچھ
سکھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کردار کے اعتبار سے یہ تنقیدی نشستیں ایک ایسا جدید ادارہ
INSTITUTION بن گئی تھیں، جنھوں نے پُرانے زمانے کے "استاد" کے ادارہ کی جگہ
لے لی تھی۔ ان کی نئی خصوصیت یہ تھی کہ یہ جمہوری دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ زیادہ
تنوع اور توانائی کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ اس دور نے میرے ذہن کو جو شکل دی اور جن خطوط
پر ڈھالا، اُن میں آئندہ بنیادی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ رنگ گہرے ہوگئے اور
تجربات کی آنچ نے کافی کچھ "خام" پختہ کیا۔

اس پس منظر میں جب آپ میرے اس مجموعہ کا مُطالعہ کریں گے تو اس میں آپ کو ایک طرح کا ڈائرکشن DIRECTION ضرور نظر آئے گا۔ البتہ یادوں کے حوالہ سے اُداسیوں کی رنگا رنگ پرچھائیاں بھی نظر آئیں گی۔ گزرا وقت، گزری محبتیں، بیتے دن، بیتی باتیں اور بچھڑے یار جب بھی یادوں کے مہمان خانے سجاتے ہیں طبیعت خود بخود اُداس ہو جاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اتنی اُداسی تو دلیلِ انسانیت ہے۔

میں جب پاکستان پہنچا تو میری ذہنی فضا اور یہاں کی فضا میں بہت فرق تھا۔ اس ٹکراؤ کے نتیجہ میں تنہائی کا احساس شدید تر ہو گیا۔ ساتھ ہی بعض عملی مشکلات نے بھی آگھیرا اس دَور میں جو دوست ہوئے اور جن کی صحبتیں سہارا بنیں ان میں ظفر عزیزی، راحت سعید جونؔ ایلیا، ممتاز سعید، نقی اختر، شکیل عادل زادہ اور حسن یوسف مرحوم تھے۔

زندگی کے اس سفر میں میں نے ذاتی سطح پر خوشیوں سے بھی تاک جھانک کی ہے اور دُکھ بھی بھگتائے ہیں لیکن تیر کھا کر کمیں گاہ کی طرف دیکھنے اور دوستوں سے ملاقات ہو جانے کی کیفیت کا اظہار آپ کو میری شاعری میں شاید ہی ملے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجموعی طور پر دوستوں نے مجھ سے محبت ہی کی ہے۔ مختصر یہ کہ زندگی نے اگر کچھ کھویا ہے تو بہت کچھ پایا بھی ہے۔ کھونے اور پانے کی اسی داستان کا عکس آپ کو اس کتاب میں نظر آئے گا۔

شاعری میرے نزدیک کسی سوئے ہوئے انسان کی بڑبڑاہٹ نہیں ہے بلکہ یہ ایک باشعور انسان کا ذریعۂ اظہار ہے۔ اب رہی نثر اور شاعری کی بات تو میں اپنے آپ کو اس خیال سے متفق پاتا ہوں کہ شاعری IMAGES کی زبان ہے اور ایک فنکار کی IMAGES کا اس کے ورلڈ ویو WORLD VIEW سے گہرا ناتا ہوتا ہے۔ جب کوئی فنکار یا ادیب یہ کہتا ہے کہ ہم فنکار تو پریم اور محبت کے پرچارک ہیں اور یہ کہ ہم تمام انسانوں سے پیار کرتے ہیں تو اُسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تمام انسانوں کے دائرہ میں تو ساؤتھ افریقہ، رہوڈیشیا اور اسرائیلی نسل پرست اور ان کے حامی بھی آجاتے ہیں۔ اس لحاظ سے

WORLD VIEW کی صحت کا مسئلہ تمام فنکاروں کے لئے اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ ہر عہد اپنی بُرائیوں کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ ہم انھیں پہچان کر اُن کے خلاف جنگ میں شرکت کریں گے تو قنوطیت اور مایوسی کے خیموں کی آگ سرد ہو جائے گی اور اُمید کی توانا روشنیوں کا حلقہ ہمارے گرد بہت سے اندھیروں کو دُور کر کے ہمیں نئی کہکشاؤں سے ہمکنار کرے گا اور ہے یوں کہ میرے خوب صورت وطن پاکستان میں بسنے والے عوام کو بہر حال اِن روشن حلقوں اور کہکشاؤں کی سخت ضرورت ہے۔

آخر میں مجھے یہ بات کہنی ہے کہ اس کتاب کی تیاری مجھ اکیلے کے بس کی بات نہ تھی میں انتہائی ممنون ہوں محمد علی صدیقی، شریف منوّر، راحت سعید اور ظفر اقبال کا، جنھوں نے ہر ہر مرحلہ پر میری رہنمائی اور مدد کی حقیقت یہ ہے کہ ان کی توجہ اور علمی تعاون کے بغیر اس مجموعہ کا اس منزل تک پہنچنا تقریباً ناممکن تھا۔

میں جناب صہبا لکھنوی کا بھی شکر گزار ہوں جن کی محبتوں نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی۔

میں جون ایلیا، قمر عباس ندیم اور شور صہبائی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے مصروفیتوں کے باوجود مشوروں سے نوازا۔

ناانصافی ہوگی، اگر میں اپنی شریکِ حیات سُہیلہ کا ذکر نہ کروں جس نے نہ صرف یہ کہ میری بکھری ہُوئی زندگی کو سمیٹا بلکہ اس کتاب کی تیاری میں بھی معاونت کی۔ اُس نے ایک عام قاری بنکر میری غزلیں اور نظمیں سنیں اور بعض مصرعوں اور لفظوں کے انتخاب میں میری مدد کی۔

کراچی میں ذرائع آمد و رفت کی دِقت کا اندازہ کسے نہیں۔ اس سلسلہ میں اپنے چھوٹے بھائی سلیم ساجد اور اپنے ہم پیشہ اقبال بلوچ کا ممنون ہوں، جنھوں نے کئی بار آسانیاں فراہم کیں۔

حسن عابد

○

ہم تیرگی میں شمع جلائے ہوئے تو ہیں
ہاتھوں میں سُرخ جام اُٹھائے ہوئے تو ہیں

اُس جانِ انجمن کے لئے بیقرار دل
آنکھوں میں انتظار سجائے ہوئے تو ہیں

میلاد ہو کہ مجلسِ غم مُبتلا ترے
آنگن میں دل کے فرش بچھائے ہوئے تو ہیں

ضربِ حرم نے شوقِ جنوں کو بڑھا دیا
سینے سے ہم بتوں کو لگائے ہوئے تو ہیں

دنیا کہاں تھی پاس وراثت کے ضمن میں
اک دین تھا سو اُس پہ لُٹائے ہوئے تو ہیں

کب چوبِ دار پر ہوں سرافراز دیکھئے
اُس شوخ کی نگاہ میں آئے ہوئے تو ہیں
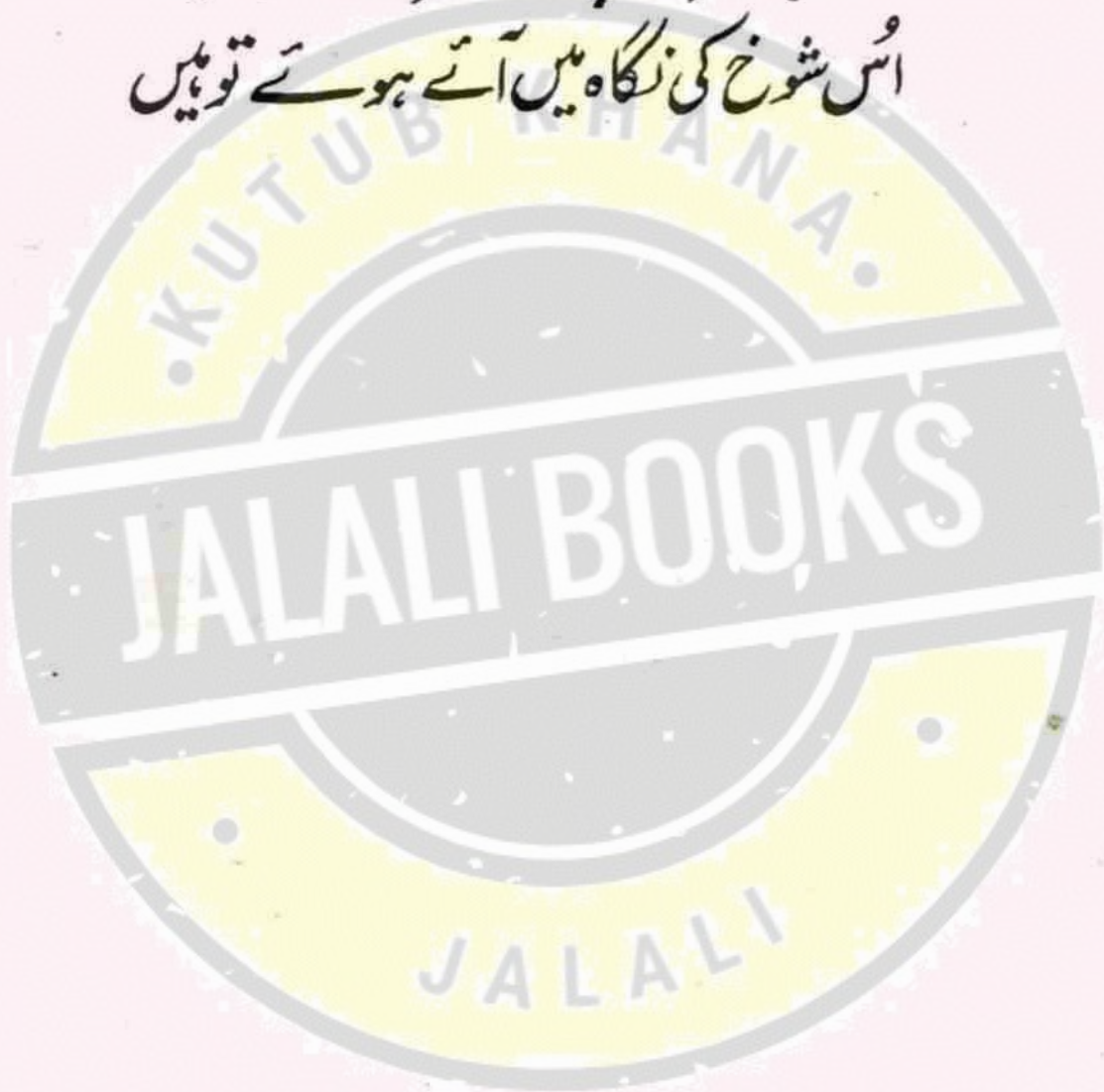
ستارہ اوج پر ہے محتسب کا
ہماری دکھ بھری شاموں کے دن ہیں

دو خواب

(پہلا خواب)

تم نے خواب دیکھا ہے

جیسے تم ستارہ ہو

اک جبل طلائی ہے

جس کی سبز چوٹی کی

آخری بلندی پر

تاج پہنے بیٹھے ہو!

چہرۂ منوّر پر

نورِ حق برستا ہے

اِس زمین کے باسی

خاکداں کے یہ ذرّے

تم کو چھو نہیں سکتے

پاک اور منزّہ ہو

(دوسرا خواب)

مَیں نے خواب دیکھا ہے
زلزلہ سا آیا ہے
آسمان کے تارے
ٹوٹ ٹوٹ گرتے ہیں
تاج کے سبھی ہیرے
بے وقار بِکھرتے ہیں
چہرۂ منوّر ہے
خاک و خوں میں غلطیدہ
اِس زمین کے باسی
خاکداں کے یہ ذرّے
آندھیوں کے کاندھوں پر
"کہکشاں مسافر" ہیں

○

خود کو پانے کی جستجو ہے وہی
اُس سے ملنے کی آرزو ہے وہی

اُس کا چہرہ اُسی کے خدّ و خال
اپنا موضوعِ گفتگو ہے وہی

ہیں اُسی کے یہ رنگ ہائے سخن
میرے پہلو میں خوب رُو ہے وہی

کتنے موسم بدل گئے لیکن
دل وہی دل کی آرزو ہے وہی

ہے وہی شوقِ چاک دامانی
اور پھر خواہشِ رفو ہے وہی

ق

سجدہ بازانِ شہر پائندہ
دستِ آذر کی آبرو ہے وہی

خوئے تسلیم سر سلامت باد
بندگی طوقِ در گلو ہے وہی

کم نہیں شورِ نالہ و فریاد
ماتمِ شہرِ آرزو ہے وہی

○

پھر سجے بزمِ طرب زلف کھُلے شانہ چلے
پھر وہی سلسلۂ شوخیِ رندانہ چلے

پھر یہ یک جائیِ یارانِ چمن ہو کہ نہ ہو
دیر تک آج ذرا بزم میں پیمانہ چلے

پھر کوئی قیس ہو آوارۂ صحرائے جنوں
پھر کسی گیسوئے شب رنگ کا افسانہ چلے

ہم وہ بدمستِ جنوں ہیں جو سرِ راہِ حیات
کبھی باہوش کبھی ہوش سے بیگانہ چلے

ہم نے چاہا تو نہ تھا اُن سے الجھنا لیکن
اس کو کیا کہیے وہ ہر چال حریفانہ چلے

وقت بدلا ہے تو پھر کیوں نہ بہ اندازِ دگر
وہی تحریکِ شکستِ خم و خمخانہ چلے
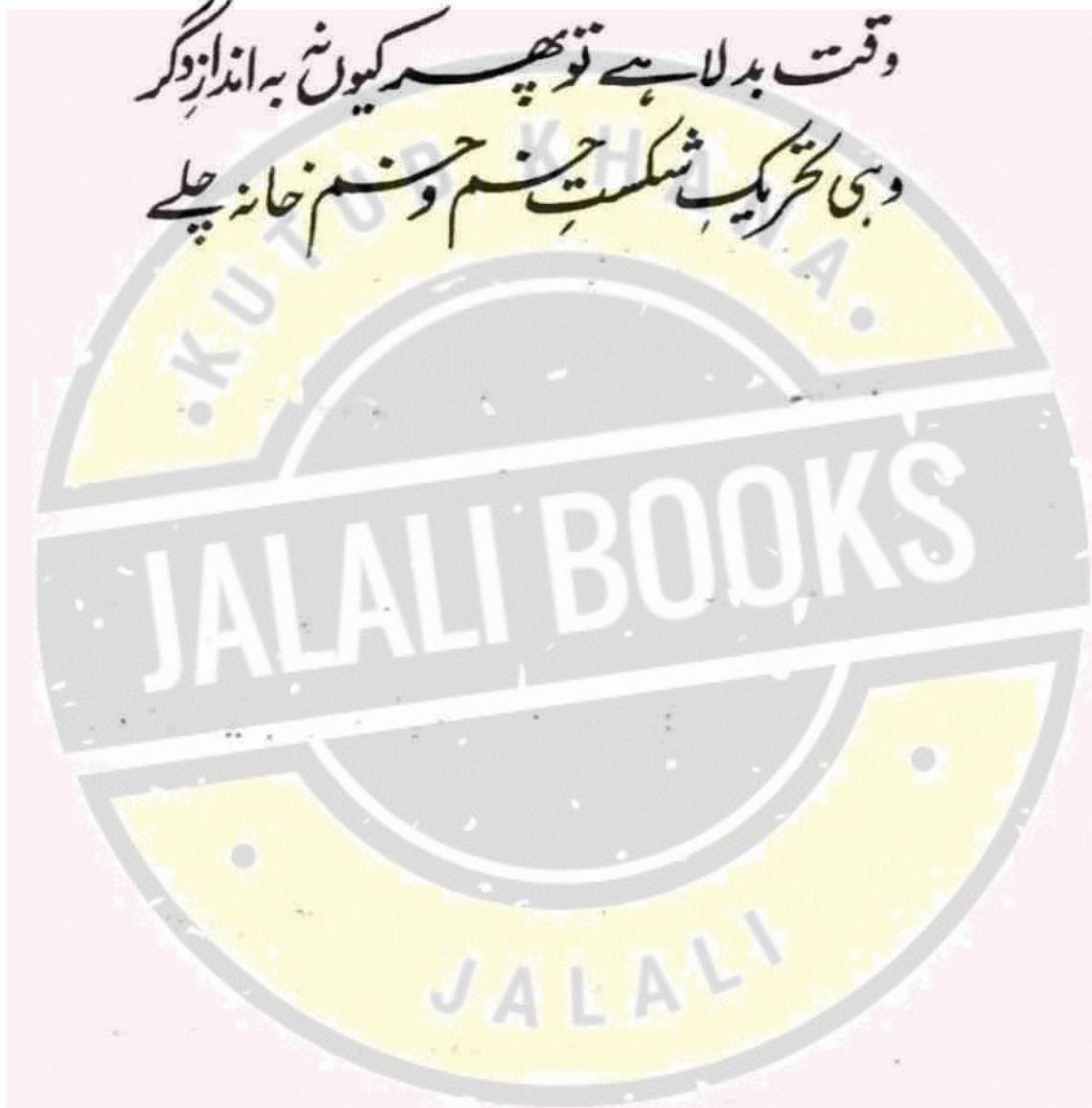
نہ جانے کیوں مجھے اکثر خیال آتا ہے
کہ میں یہاں سے بہت دور جانے والا ہوں

سوچ کا دھارا

میری دہلیز کا پتّھر ہے
تم چاہو تو لے جاؤ اِسے
سب پتّھر ایک سے ہوتے ہیں
کَل بھی
اک بچّہ آیا تھا
سہما
سہما
مَیں نے اُس سے
یہ بات کہی
تم چاہو تو لے جاؤ اِسے
سب پتّھر ایک سے ہوتے ہیں
بچّہ اکدم بول پڑا
"کچھ پتّھر ہیرے ہوتے ہیں"

مَیں

عقل و خِرد کا شیدائی

مَیں نے جب اِس پر غور کیا

اور آنکھ کھلی

مرے سامنے بُت تھا پتّھر کا

پتّھر کا یہ بُت

مندر کا خدا

کعبہ کا صَنم

مزدُور کا فن

میں کیا سمجھوں میں کیا جانوں

ہیرا کہ صنَم

پتّھر کہ خدُا

انقلاب

میری آواز کے ماتھے پہ
جلی حرفوں سے
ایک تحریر لکھی تھی
کہ جیسے

پڑھنے والوں نے پڑھا
سُننے والوں نے سُنا

رَن پڑا
دفعتاً
زیرِ زمین گاؤ کی سینگوں کا توازن بگڑا
زلزلے دَوڑ پڑے
طبقے اُلٹ گئے
پہاڑ گہرائیوں میں گِر کر ٹوٹ گئے
اور گہرائیاں اُبھر کر پہاڑوں کی جگہ جم گئیں

لب دوزی فن کاری ٹھہری کیسے دل احوال کہیں
جو موسم ہو نرگس بن کر دیکھیں اور بیمار رہیں

ٹوٹے پتے آبِ رواں کی سطح پہ تیریں موج کیساتھ
کوئی بھی رُخ ہو بہنے والے لوگ تو ہر اک سمت بہیں

ایک پرانا یار فریبی ایک حریصِ دل آزار!
کِس ظالم کی سیج سجائیں ہم کِس کی بیداد سہیں

کچھ ٹیڑھی ترچھی سی لکیریں کچھ چہروں کے خاکے سے
اِن خاکوں میں رنگ بھریں تو لوگ ہمیں فن کار کہیں

میرے پہلو میں ساجن ہے مان بھرا ارمان بھرا،
پوہ کی ٹھنڈی ٹھنڈی راتیں لوگ ہمیں خوشحال کہیں

اُلٹی اُلٹی باتیں ان کی زیدی تو دیوانے ہیں
چاند کھلے تو چہرہ جانیں دن نکلے تو رات کہیں
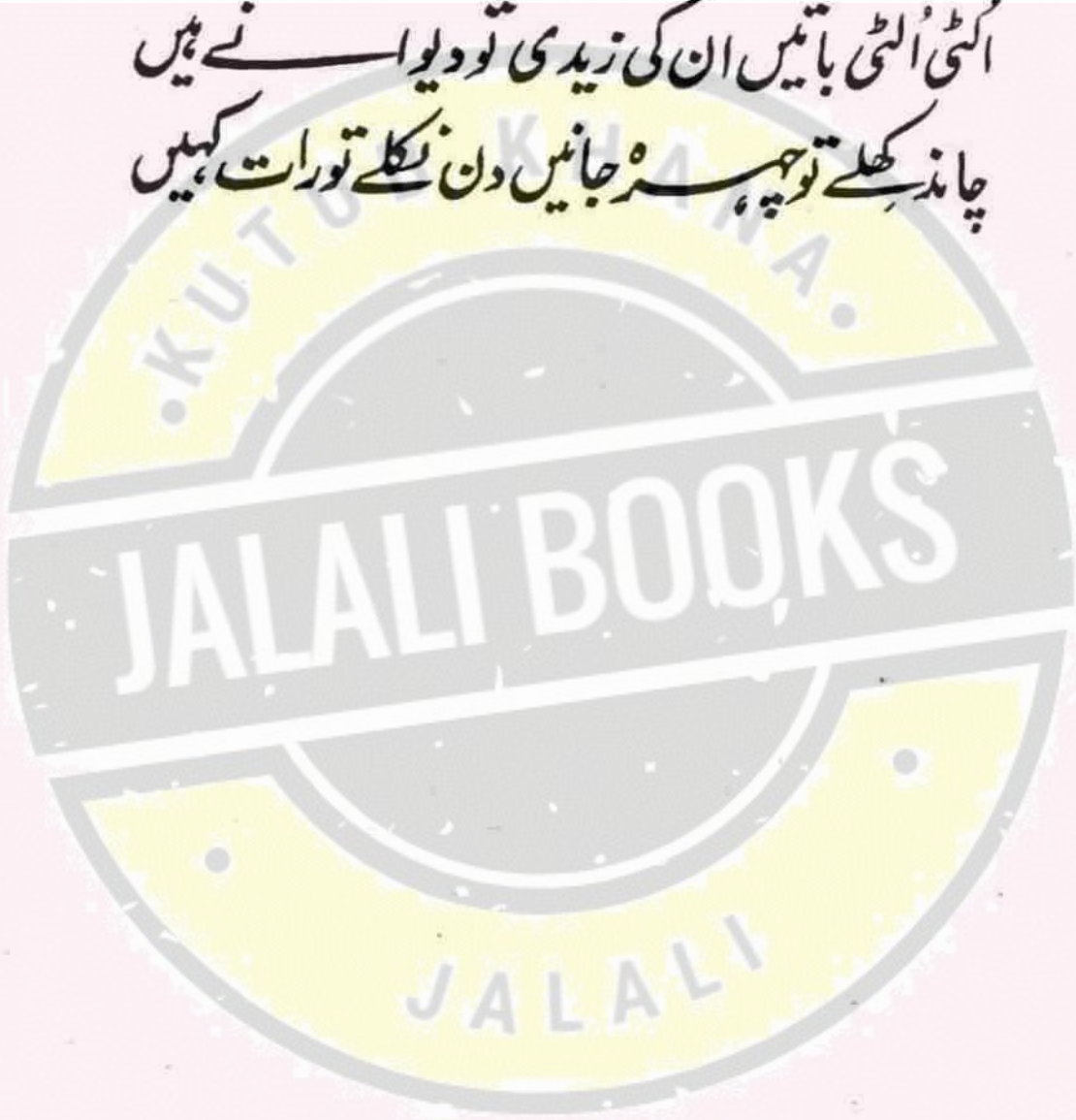
اشکوں کے گہر دوں کہ چمکتا ہوا سکّہ
کچھ پھول سے چہرے مری جانب نگراں ہیں

لکھو

آج اُس کے آنے کی دل کو ہے خوشی لکھو
شہرِ جاں کی گلیاں ہیں کیوں سجی سجی لکھو

آنکھ میں ستاروں کی سج رہی ہے جھلمل سی
رقص میں ہے ہونٹوں پر کیسی گُل ہنسی لکھو

ہاتھ ہاتھ گلدستہ چہرہ چہرہ گلشن ہے
جسم جسم مہکی ہے پھر سے زندگی لکھو

راستے میں صف بستہ پیڑ ہیں گلابوں کے
تتلیوں کے جھرمٹ میں آئی ہے خوشی لکھو

موج موج اڑتی ہے روشنی کی چادر سی
رنگ رنگ بہتی ہے جیسے خوش دلی لکھو

تارِ جاں لرزتے ہیں اُس کی جنبشِ لب سے
گونجتی ہے کانوں میں کیسی نغمگی لکھو

پاؤں میں ہواؤں کے جھانجنیں سی بجتی ہیں
موسموں کی گردش ہے رقصِ زندگی لکھو

آج تم وہی سوچو جس کو سوچ سکتے ہو
جس کو لکھ نہیں سکتے آج تم وُہی لکھو

شاخ شاخ روشن ہیں پھُول کے کنول لیکن
پہلوؤں میں چبھتی ہے خار کی انی لکھو

دُور افق پہ اُبھرے ہیں کچھ سیاہ دھبّے سے
زد میں آ گئی دیکھو پھر سے رُوشنی لکھو

لوَٹ کر نہ آ جائیں زرد موسموں کے دن
بجھ نہ جائے کلیوں کی یہ ہنسی خوشی لکھو

دل نے جو حکایت کی بات تو وُہی سچ ہے
تم نے جو محبت کی داستاں سُنی لکھو

خواب آئینہ ٹوٹا خواب جو بھی ہے کہتے ہوں
دیکھتی ہیں جو آنکھیں کم ہے کم وہی لکھو

خنجراب کی تیزی سَرد جاں ہواؤں میں
سامنے پہاڑوں پر برف ہے جمی لکھو

نَے نواز کرتے ہیں نَے نوائی شہروں میں
نرکلوں کے جنگل میں آگ ہے لگی لکھو

آسمان نارنجی بن گیا ہے شعلوں سے
آندھیاں بھی اُٹھیں گی سُرخ رنگ کی لکھو

بے زبان دیواریں چپ کھڑی ہیں رنجیدہ
یہ لہُو کے دھبّے ہیں کیوں گلی گلی لکھو!

کیوں فضا کے چہرے پر جھرّیاں سی پیدا ہیں
کیوں شکستگی آ کر خیمہ زن ہوئی لکھو

کُہرِ جبر چھایا ہے سارے شہر پر ایسا
روشنی بھی لگتی ہے کچھ بجھی بجھی لکھّو

نیل فام پانی پر کشتیاں ہیں چاندی کی
ایک ہی تو منظر ہے آج کا یہی لکھّو

ہر کسی کا چہرہ ہے مستقل شگفتہ سا
ہر کسی کے ہونٹوں پر جم گئی ہنسی لکھّو

اَب پُرانے رشتے ہیں برف کی سِلوں جیسے
اپنی ذات سے باہر سب ہیں اجنبی لکھّو

ریشمیں رشتوں کی تا لسان اوڑھی تھی!
اَب اُٹھائے پھرتے ہیں برہنہ سری لکھّو

ناخنوں پہ اُبھرے ہیں کچھ خطوط دھندلے سے
اپنے ہی لہو میں ہے نقشۂ جلی لکھّو

سبز رنگ ہیرے ہیں زینتِ قبا تے سر
پاش پاش کرنا ہے تاجِ خسروی لکھّو

سرحدوں کی چوکی پر بُت تراش بیٹھے ہیں
ضربِ سخت پڑنی ہے ایک آخری لکھّو

آ رہے ہیں آہن گر ہاتھ میں لیے خنجر
کٹ رہی ہیں زنجیریں ظلم و جبر کی لکھّو

سُرخ پھول مہکیں گے سُرخ پرچموں جیسے
ایک گیت گائیں گے سارے آدمی لکھّو

○

کچھ عجیب عالم ہے ہوش ہے نہ مستی ہے

یہ طویل تنہائی سانپ بن کے ڈستی ہے

نغمۂ تبسّم سے لب ہیں اب بھی نامحرم

شاخِ آرزو اب بھی پھول کو ترستی ہے

ہم غریب کیا جانیں مول زندگانی کا

ہم کو کیا پتہ یہ شے مہنگی ہے کہ سستی ہے

آؤ ہم بھی دیکھیں گے اُس دیار میں چل کر

کیسے لوگ رہتے ہیں کس طرح کی بستی ہے

خوب رُو تمنّائیں خوش لباس امّیدیں

شہرِ دل کی بستی بھی کیا حسین بستی ہے

خواب تھا یہ سو خواب ہے

ہم تھے اور تم تھے پر گئے وُہ دن
اچھے دن تھے گزر گئے وُہ دن

یاد آئے تو میری آنکھوں میں
اشک بن بن کے بھر گئے وُہ دن

کوئی پوچھے تو کیا بتائیں اُسے
کن غموں میں گزر گئے وُہ دن

ہم سے بچھڑے تو کیا خراب ہوئے
ہو گئے کیسے دَر بہ دَر وُہ دن

پتّہ پتّہ خزاں میں ٹوٹ گیا
لمحہ لمحہ بکھر گئے وہ دن

لے گئے نیند اڑا کے آنکھوں سے
ہم کو بے خواب کر گئے وہ دن

رات ہے اور نہ کٹنے والی رات
یہ کہاں چھوڑ کر گئے وُہ دن

ایک اک سے سوال کرتا ہوں
کوئی بولو کدھر گئے وُہ دن

کون سی بستیاں ہوئیں آباد
کن خرابوں کے گھر گئے وُہ دن

آندھیاں لے اُڑیں نقوشِ پا
رہ گزر کس نگر گئے وُہ دن

ایسے کھوئے کہ پھر کبھی نہ ملے
جو ہمیں چھوڑ کر گئے وہ دن

کس کو بتلائیں گمرہی اپنی
کس سے پوچھیں کدھر گئے وہ دن

دل کو حسرت انھیں دنوں کی ہے
دن جو بدنام کر گئے وُہ دن

جن کو ہم یاد کرتے رہتے ہیں
جو جنوں میں گزر گئے وُہ دن

پھر نہ ابھرے نقوش دل پہ کوئی
آئینہ توڑ کر گئے وُہ دن

خواب دیکھا تھا ایسا لگتا ہے
خواب ہی میں گزر گئے وُہ دن

تلخیاں لفظ بن کے اڑتی ہیں
زہر سینے میں بھر گئے وُہ دن

جو ہماری بہار کے دن تھے
بے حکایت گزر گئے وُہ دن

چاک دامن ہوئے نہ چاک جگر
بے جنوں بے ہُنر گئے وُہ دن

جن کو نسبت تھی آرزوؤں سے
خون میں تر بہ تر گئے وُہ دن

سوچتا کیا اب اُن کے بارے میں
جیسے گزرے گزر گئے وُہ دن

اَب پلٹ کر کبھی نہ آئیں گے
یوں سمجھ لو کہ مر گئے وُہ دن

○

احتیاط اے دلِ ناداں وہ زمانے نہ رہے

تیرے عُشّاق ترے چاہنے والے نہ رہے

جن سے قائم تھی تری شوخ نگاہی کی ادا

رنگِ محفل وہ جنوں خیز اشارے نہ رہے

اے گُلِ شوخ ادا تجھ کو خبر ہے کہ نہیں !!

جو محافظ تھے ترے اَب وہی کانٹے نہ رہے

ہم جنھیں ہم سفرِ راہِ وفا جانتے تھے

کیا بتائیں کہ وُہی لوگ ہمارے نہ رہے

صبح سے شام تلک بارشِ انوار رہی

رات آئی تو اِن آنکھوں میں ستارے نہ رہے

○

چاہے بھی دل تو درد کی مہلت کہاں سے لائیں
ہم تم سے ربطِ خاص کی فرصت کہاں سے لائیں

دل معترف تو ہے نگہِ التفات کا
لیکن اس التفات کی قیمت کہاں سے لائیں

جو تیرے بازوؤں میں بھی بے چین ہی رہا
اُس کے لئے سکون کی دولت کہاں سے لائیں

سرزد ہوئے گناہ جو سرِ ابتدائے شوق!
حسرت ہیں آج بھی وہ ندامت کہاں سے لائیں

اندیشہ

کل تک مجھے فکر ہی نہیں تھی
اور آج یہ دل دھڑک رہا ہے
کیا جانیے شب بسر ہو کیسے
ہر لمحہ خیال آ رہا ہے

بجھ جائے نہ آرزو کی مشعل
ہو جاؤ نہ تم نظر سے اوجھل

○

پلکوں پہ آنسوؤں کے ستارے سجے ہوئے
آنکھوں میں انتظار کے لمحے بسے ہوئے

کیا کیا کمال خواب اِن آنکھوں میں آئے ہیں
اُس خوش نما بدن کی مہک میں بسے ہوئے

گزرے گا ایک روز وُہ ان وادیوں سے بھی
صدیاں گزر گئی ہیں یہی سوچتے ہوئے

مسموم ہے فضا تو سنانے سے فائدہ
کیا کیا ہیں دل میں خواب ہمارے بُنے ہوئے

تھا ایک میں ہی خنجرِ قاتل کے سامنے
یارانِ باوفا تھے کنارے کھڑے ہوئے

ہونٹوں پہ تھی سکوت کی زردی مُلی مُلی
آنکھوں میں احتیاط کے حلقے پڑے ہوئے

شہروں کی آگ اُڑ کے یہاں تک پہنچ گئی
آنکھوں کے ساتھ ساتھ ہیں جنگل جلے ہوئے

سائے ہوئے ہیں جمع درختوں کے آس پاس
آئیں گے کوئی روز مسافر تھکے ہوئے

دستِ دراز چاہیئے حاصل کے واسطے
سب راہ کے شجر ہیں پھلوں سے لدے ہوئے

افتادگاں نواز مسافر کی راہ میں
پیڑوں کے آس پاس ہیں سائے پڑے ہوئے

○

یہ اور بات ہے کہ طرحدار ہم بھی ہیں
لیکن تری ادا کے گرفتار ہم بھی ہیں

ہاں کُشتگانِ جرأتِ انکار ہم بھی ہیں
یوں ہے کہ اپنے عہد کا اقرار ہم بھی ہیں

نسبت ہمیں بھی اُس گُلِ پیرہن سے ہے
آوارگانِ کوچۂ دلدار ہم بھی ہیں

اِک شخص ہے کہ جس کی تمنّا ہمیں بھی ہے
اِک زندگی ہے جس کے طلبگار ہم بھی ہیں

اے زندگی کی دھوپ میں تپتے ہوئے بدن
اس سمت آ کہ سایۂ دیوار ہم بھی ہیں

یہ مرے خواب

تم مرے پاس تو آؤ مری باتیں تو سنو
بس کوئی زہر نہیں زنگ نہیں سنگ نہیں
تم مرے پاس تو آؤ مرے پہلو بیٹھو

مجھ سے تم اتنا گریزاں ہو یہ وحشت کیا ہے
اتنی خاموش ہو کیوں مجھ سے شکایت کیا ہے
چند لمحے تو رکو ایسی بھی عجلت کیا ہے

جب کوئی سامنے بیٹھا ہو تو روحِ تہذیب
یوں لگاتار خلا میں نہیں گھورا کرتے
جب کوئی اتنا پریشاں ہو کسی کی خاطر
اُس سے یوں جان کے اے جاں نہیں رُوٹھا کرتے

زندگی سخت تھی بے رُوح چٹانوں کی طرح
تم جو آئی ہو تو کچھ موسمِ جاں بدلا ہے
مدّتوں بعد اِن آنکھوں کا سماں بدلا ہے

یہ خنک رات ہے اک پردۂ سیمیں جس پر
جھلملاتے ہوئے ماضی کے مناظر ہیں رَواں

کیا تمھیں یاد ہیں محبوب محل کے وُہ دن
جب کسی سے کوئی چھُپ چھُپ کے مِلا کرتا تھا
جب ستاروں بھری راتوں کی حسیں چھاؤں تلے
چاند ہر شب مری باہوں میں کھِلا کرتا تھا

زلف زنجیر کلائی میں پہنا کر جاناں
تم مجھے اپنا گرفتار کیا کرتی تھیں
وقتِ رخصت یہی نمناک غزالی آنکھیں
بن کسی روگ ہی بیمار کیا کرتی تھیں

جب بٹھاتے تھے بڑے اپنی نظر کے پہرے
ہم چُرا لیتے تھے پھر بھی وہ گلابی لمحے
جن کی خوشبو سے مہک اُٹھتے تھے آنگن دل کے

جب کسی گوشۂ بے نام کی تنہائی میں
دو دھڑکتے ہوئے دل عہدِ وفا کرتے تھے
اور اندھیرے میں لپٹتی ہوئی سانسوں کے کنول
رُوح میں جیسے اُجالا سا کیا کرتے تھے

جب کہیں سے کسی اُڑتے ہوئے بادل کی طرح
میری آغوش میں آتے تھے وہ چنچل لمحے
سحر کرتی تھی جنوں خیز بدن کی خوشبو
اور دونوں کو کیا کرتے تھے بے کل لمحے

تنگ ہوتا ہوا حلقہ مری باہنوں کا تمھیں!
شرم کی لہر سے گُلنار بنا دیتا تھا
بال تپتے ہوئے چہرے پہ بکھر جاتے تھے
چاند اپنے کو تہہ ابر چھُپا لیتا تھا

پھیلتے سایوں کی مہکی ہوئی دلدار فضا
حسُن کو عشق کی آغوش میں لے آتی تھی
دیکھ کر فطرتِ معصوم کا اظہارِ حسیں
چاندنی ہنستی ہوئی دُور چلی جاتی تھی

تم مہکتے ہوئے مہندی لگے ان ہاتھوں سے
میری آنکھوں کو بصد ناز چھُپا لیتی تھیں
پھر لبِ شوخ تمنّا سے ذرا آہستہ ——!
میرے ہونٹوں پہ کئی پھول سجا دیتی تھیں

خواہشیں صحن میں جسموں کے مچلتی تھیں مگر
تشنہ تشنہ سے رہا کرتے تھے پیاسے لمحے
مدّتوں بعد یہ احساس ہوا ہے مجھ کو
وہی لمحے تھے مری زیست کے سچّے لمحے

یوکلپٹس کا وہ پیڑ آج بھی ہے بوڑھا سا
جس کے سائے میں جھپک جاتی تھیں ناظر آنکھیں
پھر مِرے پیار میں ڈوبی ہوئی بھیگی بھیگی
سہمی سہمی سی اُٹھا کرتی تھیں ساحر آنکھیں

تم مجھے دیکھتی رہتی تھیں بڑے غور کے ساتھ
اور پھر خود ہی چھپا لیتی تھیں چہرہ اپنا
دفعتاً وقت کی چادر میں پڑی ایک شکن
ناگہاں ٹوٹ گیا میرا سنہرا سپنا

رات کے پچھلے پہر آج پھر اِن آنکھوں نے
خواب دیکھا تب مجھے اور بھی بے خواب کیا

سامنے پیڑ کے پہلو میں چمکتا ہوا چاند
اپنے محبُوب ستاروں کے حسیں جُھرمُٹ میں
یوں جما بیٹھا ہے جس طرح کوئی شہزادہ

اور میں ہجر زدہ رات میں تنہا تنہا
کروٹیں لیتا ہوا درد مرے سینہ میں
تم مرے پاس نہیں ہو تو کِسے دکھلاؤں

یہ مرے خواب مرا درد بڑھاتے کیوں ہیں
بھُولنے والے کو اب یاد دِلاتے کیوں ہیں

○

دہکی ہوئی فضا ہے جو اُن آنچلوں کے پاس
رہتی ہے ایک آگ سی شعلہ رُخوں کے پاس

لپٹیں سی اُٹھ رہی ہیں بدن کے چنار سے
لَو دے اُٹھا ہے سایۂ لب عارضوں کے پاس

زلفِ سیاہ دام ہے کیوں کر نہ بچے گا دِل
سحرِ شبِ وصال ہے جادوگروں کے پاس

پہلو میں ہے وہ شوخ بدن زیرِ ماہتاب
پُر موج ہو رہا ہے سمندر لبوں کے پاس

ترکانِ شوخ رنگ ہیں آفت مگر یہ بات
محفوظ دائروں میں ہے صاجندلوں کے پاس

لالہ بدن وصالِ سفیدرانِ بحر سے
بھیگے ہوئے پڑے ہیں کنول ساحلوں کے پاس

ہر شخص اُلجھنوں کے گھنے جنگلوں میں ہے
چلنے کو راستہ بھی نہیں رہروؤں کے پاس

آرزو

سیاہ رات کے آنگن میں سر جھکائے ہوئے
نہ جانے کب سے مری آرزو ہے خاک نشیں
تھپک رہی ہے فضا جاگتے ستاروں کو
چمک رہے ہیں جو میری دراز پلکوں پر
کوئی نہیں جو مرے پاس آکے چپکے سے
مجھے سمیٹ لے اپنی گداز باہنوں میں

نہ کوئی چاند سی صورت نہ کوئی جسمِ حسیں
نہ کوئی قامتِ رعنا نہ ساعدِ سیمیں
بس ایک پیار بھرا دل جو مجھ سے پیار کرے
مرے خلوصِ محبت پہ دل نثار کرے

ہم سے کہتے ہو دُکھ اُٹھاؤ مت
شرط یہ ہے کہ یاد آؤ مت

بھول جاتے ہیں بھولنے والے
تم سے اَب کیا کہیں بھلاؤ مت

یہ سبا نے بتا گئے ہیں ہمیں
دل کسی کا کبھی دُکھاؤ مت

وہ گلِ سادہ کار شوخ بھی ہے
تم نیا گل کوئی کھلاؤ مت

خاک ہو بیٹھے اُس کے کوچہ میں
اے صبا اب ہمیں اٹھائیو مت

ایک صحرا نشیں یہ کہتا تھا
دل کِسو سے کبھو لگائیو مت

یہ فریبِ نظر ہے جو کچھ ہے
یہ فریبِ نظر ہے کھائیو مت

رات ڈھلتی ہے نشہ چڑھتا ہے
ابھی محفل سے جسم اٹھائیو مت

ایک بُت تھا جو بن گیا ہے خدا
اب نیا بُت کوئی بنائیو مت

ق

کوئی راحت سعید سے کہہ دے
جانِ جاں دور دیس جائیو مت

عمر ساعت ہے یا گھڑی یا پل
اور یہ پل ہجر میں بتائیو مت

یہ بیاضِ ہنر کا نسخہ ہے
شعر ہر ایک کو سنائیو مت

تم سے رونق ہے اے حسن عابد
جانِ محفل سے اٹھ کے جائیو مت

ے میرے دوست جن کی پوسٹنگ ملک سے باہر ہونے والی ہے۔

ہنوز تشنگی

میں ایک شام کو گوشے میں اپنے کالج کے
یونہی اُداس سا بیٹھا تھا سر جھکائے ہوئے
تصوّرات کی بے کیفیوں میں کھویا ہوا
نہ پوری طرح سے جاگا ہوا نہ سویا ہوا
یہ سوچتا تھا کہ پچّیسویں بہار کیسا تھ
گزار لایا ہوں اِس زندگی کی آدھی رات

مگر ہنوز وہی تشنگیٔ دیرینہ!
وہی فریب کے ساغر خیال کی مینا

○

دو عالم کی خوشی سے کم نہیں ہے
ترا بخشا ہوا غم کم نہیں ہے

سرورِ آغازِ اُلفت کا بہت ہے
مجھے انجام کا کچھ غم نہیں ہے

کِسے سونپوں ترے غم کی امانت
کوئی اِس راز کا محرم نہیں ہے

بہت ہیں پُرسشِ غم کرنے والے
مگر کوئی شریکِ غم نہیں ہے

ابھی کچھ اور ہو برباد دُنیا
ابھی چشمِ حقیقت نَم نہیں ہے

..... چاہتا ہوں

بتاؤں کیا کہ میں کیا چاہتا ہوں
کہوں کیوں کر کہ ایسا چاہتا ہوں
کبھی تم خود سمجھ لیتی تھیں سب کچھ
یہ سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں
تمھیں بتلاؤں تم سُن بھی سکو گی!
میں اَب ترکِ تمنّا چاہتا ہوں
بہت دُور آ گیا تھا بے خودی میں
مگر اَب لَوٹ جانا چاہتا ہوں
وہ دن شاید تمھیں بھُولے نہ ہوں گے
وہ دن جو میں بھُلانا چاہتا ہوں
بہت بیٹھا تمھاری خلوتوں میں
اَب ایسا ہے کہ جانا چاہتا ہوں
بہت جاگا ہوں شب ہائے طلب میں
کہیں اَب پڑ کے سونا چاہتا ہوں

جو تم خوش ہو تو میرے فائدے ہیں
مگر میں اِس کا اُلٹا چاہتا ہوں
بڑی محفوظ تھی میری جوانی
مگر اَب اِس کا سودا چاہتا ہوں
مری شاموں کو رُسوا کرنے والے
میں اِن شاموں کا بدلا چاہتا ہوں
تمھیں اک آخری پیغام لکھ دوں
سو کچھ اوراقِ سادہ چاہتا ہوں

محبّت خود خلافِ مصلِحت ہے
محبّت مصلِحت کوشی نہیں ہے
یہ ہے اک جذبۂ بے اختیاری
کسی کا جس پہ قابو ہی نہیں ہے

محبّت آنسوؤں کا ہار بھی ہے
محبّت صرف گُل پوشی نہیں ہے

○

اُس سے ملنے کا اپنا عالم ہے
دل میں اک خوشگوار سا غم ہے

تلخیاں اَب بھی ہیں بہت سی مگر
آج ان کا اثر ذرا کم ہے

دھوپ کیا اُٹھ گئی ہے آنگن سے
زندگی شام کا سا عالم ہے

روز و شب کس طرح بسر کیجے
غم نہیں ہے کوئی یہی غم ہے

اُس سے ملنے کا، بات کرنے کا
اب بھی ہے سلسلہ مگر کم ہے

زخم کا شوق بھی ہے اور دل کو
ابتدا ہی سے فکرِ مرہم ہے

سب کی ہر بات لگ رہی ہے بُری
کچھ عجب وحشتوں کا عالم ہے

ہجر سے ہے طوالتِ شبِ غم
ورنہ یہ زندگی بہت کم ہے

بِن مرے اب بھی ہے وجودِ چمن!
پر مرا غم بہار کا غم ہے

ایک ہی خواب دل نے دیکھا تھا
اَب تو بے خوابیوں کا عالم ہے

جی نہیں لگ رہا کسی شے میں
اِن دنوں کچھ عجیب عالم ہے

گُل گُلچیں

مِری آوارگی ضربُ المثل تھی
میں سنجیدہ کہاں تھا زندگی میں
ہوا کا ایک جھونکا تھا کہ جس نے
مجھے اُس گُل کا گرویدہ کیا تھا

وہ گُل اَب میرا گُلچیں بن چُکا ہے

○

وقت عجیب چیز ہے وقت کے ساتھ ڈھل گئے
تم بھی بہت بدل گئے، ہم بھی بہت بدل گئے

میرے لبوں کے واسطے اب وہ سماعتیں کہاں
تم سے کہیں بھی کیا کہ تم دُور بہت نکل گئے

تیز ہوا نے ہر طرف آگ بکھیر دی تمام
اپنے ہی گھر کا ذکر کیا شہر کے شہر جل گئے

موجۂ گُل سے ہمکنار اہلِ جنوں عجیب تھے
جانے کہاں سے آئے تھے جانے کدھر نکل گئے

شوقِ وصال تھا بہت سو ہے وصال ہی وصال
ہجر کے رنگ اب کہاں موسمِ غم بدل گئے

صورتِ حال اب یہ ہے لوگ خلاف ہیں مرے
اے مرے ہم خیال و خواب تم تو نہیں بدل گئے

بوئے گل اور حصارِ گل اہلِ چمن پہ ظلم ہے
اپنی حدودِ ذات سے جان کے ہم نکل گئے

آبِ حیات جان کر زہر پیا گیا یہاں،
زہر بھی خامشی کا زہر جسم تمام گل گئے

شمع بدن بھی تھے کئی راہِ جنوں میں ہم سفر
تابِ مقاومت نہ تھی، دھوپ پڑی پگھل گئے

یہ خواب ہی تو نہیں

چمن سے رخصتِ ابرِ بہار ہے شاید

زمین خشک ہے بیوہ کی چھاتیوں کی طرح
فضا میں خاک بسر برگ و بار اُڑتے ہیں
ہوائیں چیختی پھرتی ہیں وحشیوں کی طرح

ہر ایک شاخ پہ ویرانیوں کے ڈیرے ہیں
اُداسیوں کا ہے مسکن تمام صحنِ چمن

سپید چہرے ہیں جیسے دُھلے ہوئے کپڑے
گلوں پہ خون کی ہلکی سی چھینٹ بھی تو نہیں

یہ بیوگی جو مقدّر بنی ہے گلشن کا
یہ دائمی تو نہیں
پلٹ کے آئے گا ابرِ بہار کا موسم
یہ خواب ہی تو نہیں

○

شہر میں شور ہے اُس شوخ کے آجانے کا
ہر کوئی رُوپ بھرے پھرتا ہے دیوانے کا

رِند و واعظ تھے بہم دست و گریباں کل رات
جانے کیا حال ہوا شیشہ و پیمانے کا

شب کا عالم تھا جُدا دن کے تماشے کچھ اور
اُس سے کیا ذکر کریں رات کے افسانے کا

تر بہ تر خون میں ہے دامنِ اُمیدِ بہار
ہاتھ میں زخم ہے ٹوٹے ہوئے پیمانے کا

اُس کی آنکھوں میں وہی رنگ وہی حُسنِ طلب
دل کو سمجھائیں مگر فائدہ سمجھانے کا

صحن مسجد کا ہے اور حافظ و خیام کے شعر
جام غائب ہیں مگر رنگ ہے مے خانے کا

کن کافروں کی روح کا سایہ پڑا کہ ہم
آسودۂ تصوّرِ ایماں نہ ہو سکے

○

کوئی کیسا ہے دھیان آیا تو ہوگا
کبھی کچھ خواب سا دیکھا تو ہوگا

مَیں تم سے کیا کہوں دل کی تمنّا
تمھارا دل بھی کچھ کہتا تو ہوگا

مَیں کیوں آیا تمھاری زندگی میں
کبھی تم نے مجھے سوچا تو ہوگا

مَیں ہوں ناواقفِ آدابِ محفل
میری باتوں پہ ہنگامہ تو ہوگا

وہ میرا دوست ہے اور دوستی میں
کبھی تلخی کبھی جھگڑا تو ہوگا

یہاں جب ہیں تو فکرِ عاقبت ہے
وہاں رہ کر غمِ دنیا تو ہوگا

کہاں صحرا میں تنہائی کہ اے دل
نہ ہو کچھ پھر بھی سناٹا تو ہوگا

ق

لبوں کا حرف جملہ بن گیا ہے
یہ اس بستی میں دُکھ سہنا تو ہوگا

گراں گوشی صفت ہے اس نگر میں
کہ سُن کر بات کچھ کہنا تو ہوگا

○

یاد آؤ تو منا لیں یہ سہولت بھی نہیں
بھول جائیں تمھیں ایسی کوئی صورت بھی نہیں

فاصلے وہ ہیں کہ اس گردشِ دوراں کے طفیل
ہم کبھی تم سے ملیں گے، یہ ضمانت بھی نہیں

بھول جاتے ہیں یونہی لوگ، یہی ہوتا ہے
تم سے رنجش تو کجا تم سے شکایت بھی نہیں

ق

جب چلے آئے تھے بیتاب سرِ کوچۂ شوق
اب وہ سرجوشیِ آغازِ محبت بھی نہیں

جس سے دل تھا صنم آباد و تمنّا آثار
اب مرے پاس وہ سرمایۂ وحشت بھی نہیں

جس نے ہلکان کیا تھا کبھی ہم دونوں کو!!
دل میں اَب وہ ہَوسِ دردِ محبت بھی نہیں

ہم سے کیوں اتنا گریزاں ہے وہ جانِ محفل
ہم کہ ناواقفِ آدابِ محبت بھی نہیں

پہلے کب اس سے زیادہ کے سزاوار تھے ہم
اب یہ بات اور وہ اندازِ عداوت بھی نہیں

دوستوں نے مجھے چاہا یہ عنایت اُن کی
مَیں وہ مفلس کہ مرے پاس یہ دولت بھی نہیں

دل کہ تمام زخم ہے

دل کہ تمام زخم ہے زخم دِکھا رہا ہوں میں
یاد جو آ رہی ہو تم یاد دلا رہا ہوں میں

تم مری ہم خیال تھیں تم مِرے ساتھ ساتھ تھیں
آج بھی دل میں سوچ کر فخر سا پا رہا ہوں میں

کیا تمھیں یاد ہیں وہ دِن دِن جو کہیں چلے گئے
رُوٹھ گئی ہو مجھ سے تم اور منا رہا ہوں میں

بسترِ خواب پر ہو تم نیم دراز بے حجاب
اور تکلّفات کی رسم اُٹھا رہا ہوں میں

رات نے اپنی شال میں دن کو چھپا لیا مگر
وقت سے بے خبر ہو تم وقت بتا رہا ہوں میں

یہ بھی ہوا کبھی کبھی خود کو گمانِ دلفریب
دُور چلی گئی ہو تم اور بُلا رہا ہوں میں

تم نے کہا تھا اب کبھی دُور نہ ہوگی مجھ سے تم
آج تمھیں تمھاری بات یاد دِلا رہا ہوں میں

کوئی پُوچھے تو کیا بتلائیں اُس سے سلسلہ کیا ہے
ہمارے درمیاں کچھ اَن کہی باتوں کا رشتہ ہے
مگر اک بات ہے تم سوچ لو پھر مجھ کو سمجھانا
وہ مجھ سے رُوٹھ کر بھی میرے ہی پہلو میں سویا ہے

○

وہ جو نہیں ہے آج پاس بات کریں تو کیا کریں
جی ہے بہت اُداس اُداس بات کریں تو کیا کریں

بجھ گئی کہکشاں کی مانگ شب کا سہاگ اُجڑ گیا
ٹوٹ چکی ہے دل کی آس بات کریں تو کیا کریں

اُس کے تمام رنگ تھے میری بہار گفتگو
اب جو نہیں وُہ رنگ پاس بات کریں تو کیا کریں

آئینۂ خیال میں عکس ہے ایک مُستقل
درد ہے اور دل کے پاس بات کریں تو کیا کریں

محفلِ رنگ اُجڑ چکی یار بچھڑ گئے سبھی!
یاد ہے اور سکوتِ یاس بات کریں تو کیا کریں

لمحۂ شوق میں اُسے جانِ وفا کہا گیا!
اپنی سمجھ کا التباس بات کریں تو کیا کریں

زیست ہے خواب اور ہم اُس سے ملے ہیں خواب میں
خواب ہے خواب کی اساس بات کریں تو کیا کریں

برہنگیٔ روح کا ذکر ہے اور بزم میں!
لوگ سبھی ہیں خوش لباس بات کریں تو کیا کریں

حُرمتِ حرف اب کہاں عزّتِ لفظ داستاں
کون ہے یاں سخن شناس بات کریں تو کیا کریں

لوگ مُصِر ہیں اور مَیں سوچ رہا ہوں یہ حسن
جب نہ ہو کوئی بات خاص بات کریں تو کیا کریں

خوش آمدید

یہ شام سانولی رقّاصہ کی طرح کفِ پر
اٹھا کے لائی ہے جامِ شرابِ کیف آگیں
یہ شام آج اِس انداز سے ہے جلوہ فشاں
کہ جیسے بن کے دُلہن آئے کوئی زہرہ جبیں

مہک رہی ہے فضا گیسوؤں کی خوشبُو سے
لبوں کی برقِ تبسّم سے آشنائی ہے
کھلے ہوئے ہیں گلوں کی طرح حسیں چہرے
بہار پھُولوں کے کچھ ہار لے کے آئی ہے

یہ ہار نذر ہیں ان دوستوں کی خدمت میں
خوش آمدید مرے خوش جمال مہمانو

○

وہ خدا لوگ بندگانِ خدا
اور مجھے بندگی پسند نہیں

کیا کہوں زندگی کے بارے میں
مجھ کو یہ زندگی پسند نہیں

ہاں بہی کچھ یہ رنگ رنگ بدن
ہاں مجھے اب بہی پسند نہیں

ڈوب مرتے ہیں لوگ غیرت میں
پَر مجھے خودکشی پسند نہیں

تم اندھیرے میں کیوں چلے آئے
اب مجھے روشنی پسند نہیں

کیا زمانہ ہے اس زمانے میں
آدمی آدمی پسند نہیں

جانِ جاں خوب ہیں یہ باتیں بھی
پر مجھے باتیں ہی پسند نہیں

زندگی کا ہر لمحہ درد سے عبارت ہے
آپ کی محبّت ہے آپ کی عنایت ہے

○

ہوائے موسمِ گُل تھی کہ تیرے دیوانے
کہاں سے آئے کدھر چل دیئے خدا جانے

غریبِ شہر ہیں پر آؤ میکدے کو چلیں
نظر تو آئیں گے کچھ لوگ جانے پہچانے

نہ چاکِ جیب کی پروا نہ ہوش دامن کا
عجیب حال میں رہتے ہیں تیرے دیوانے

نشاطِ زیست میسّر نہیں یہ کیا کیجے
ہزار ضبطِ طلب پر اگر نہ دل مانے

کبھی جو گزرے کسی دشت سے ہم اہلِ جنوں
سروں پہ سایہ کیا طائرانِ صحرا نے

تری نگاہ کی جنبش نے خیر کی ورنہ
بہک چلے تھے نہ جانے کدھر یہ دیوانے

ترے جمال نے روشن کیا چراغِ نظر
کہ جگمگانے لگے ہیں تمام ویرانے

گزر گئے ہیں ہر اک خار زار سے ہو کر
تری تلاش میں گُم ہو کے تیرے دیوانے

حیات قوسِ قزح ہے ہزار رنگوں کی
وہی نظر جو حقیقت کا رنگ پہچانے

نہ اب وہ دَور رہا اور نہ وہ اصولِ حیات
بدل چکے ہیں نئی زندگی کے پیمانے

تمام رات جو ٹپکے ہیں چشمِ پُرنم سے
کسے سنائیں محبت بھرے وہ افسانے

جنھیں خود اپنی طبیعت پہ اعتبار نہ تھا
کچھ ایسے لوگ بھی آئے تھے مجھ کو سمجھانے

تراشں کردہَ یارانِ زھد ہیں ورنہ
حقیقتوں سے بہت دُور ہیں یہ افسانے

تمام عُمر رہا جو رہینِ بندشِ غم
وہ شخص رحمتِ پروردگار کیا جانے

سنا یہ ہے.....

سنا یہ ہے کہ مجھے بد دعائیں دیتی ہو
سنا یہ ہے کہ مرے نام سے بھی ہو بیزار
سنا یہ ہے کہ اُن آنکھوں کے تذکرہ سے بھی اَب
گریز کرتی ہو جن پہ تھی کائنات نثار

سُنا یہ ہے کہ بظاہر ہو مطمئن لیکن!
کبھی کبھی تمہیں غصہ سا آنے لگتا ہے
یہ نعمتیں، یہ کسی کا خلوصِ مصنوعی
اجاڑ دل کو تمہارے جلانے لگتا ہے

سنا یہ ہے کہ تمھیں زندگی سے نفرت ہے
جو تم کو مل نہ سکی اُس خوشی سے نفرت ہے
یہ سارے لفظ یونہی کھوکھلے سے لگتے ہیں
وفا، خلوص، محبّت سبھی سے نفرت ہے

سنا یہ ہے کہ تم اب بھی یہ بات کہتی ہو
کہ مَیں نے تم سے فقط ایک کھیل کھیلا تھا
جو عہد ٹوٹ گئے اُن کو توڑ دینے میں
تمھارا ہاتھ نہ تھا سب قصور میرا تھا

عجیب طرح کے اِلزام مجھ پہ آئے ہیں
تمھارا فنِ سخن کیوں نہ خود پہ ناز کرے
خِرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بہت بُرا ہوں میں پھر بھی یہ بات کیسے کہوں
کہ تم نے حرمتِ نسبت کو تار تار کیا
تمہاری موجِ روش نے اُڑا کے چھینٹوں کو
مرا لباسِ تمنّا بھی داغدار کیا

تمہارے اپنے کیے کی یہ اب سزا ہے کہ تم
تمام عمر اسی طرح بے قرار رہو
چلے ہوا تو یہ سمجھو کہ میں نے دستک دی
تمام عمر یونہی محوِ انتظار رہو

○

تھے وہ قصّے مگر سَراب کے تھے
جانے والے خیال و خواب کے تھے

لمحہ لمحہ کسی کی یادیں تھیں
روز و شب تھے مگر عذاب کے تھے

اُس کا چہرہ تھا اور شیشوں میں
عکس کھِلتے ہوئے گلاب کے تھے

گردِ رہ تھی میانِ منزل و دِل
دُھندلے دُھندلے نقوش خواب کے تھے

○

تھا آسمان پر جو ستارہ نہیں رہا
یادش بخیر اَب وُہ ہمارا نہیں رہا

جو دن گزر گئے وہ گزر ہی گئے سو اَب
یادوں کے ماسوا کوئی چارہ نہیں رہا

سیلِ رَواں میں گُم ہے نشانِ محیطِ آب
اے موجِ مُضطرب وہ کنارا نہیں رہا

تنہا تھے جب تو آنکھ کے آنسو بھی دل میں تھے
وہ آ گیا تو ضبط کا یارا نہیں رہا

نقشِ کفِ پا

مرے اُوپر تم افسانہ لکھو گے
اور اُس میں مجھ کو دیوانہ لکھو گے
مگر میں تم کو بتلاتا ہوں پیارے
تمھارے آسماں کے چاند تارے
مرے نقشِ کفِ پا بن چکے ہیں

○

ہر اچھی صورت کا لوبھی ہر مکھ کا متوالا ہے
صاحب دل کی بات نہ پوچھو دل کا ڈھنگ نرالا ہے

ایک زمانہ بیتا ہم ہیں درشن سے محروم مگر
دیوی تیرے روپ کا ابتک من مندر میں اجالا ہے

تم نے کتنے دکھ جھیلے ہیں ہم نے کتنے دکھ پائے
دکھ کی گنتی کرنے والو کون یہاں سکھ والا ہے

اپنے اپنے دیس کے باسی ایک سرائے میں آن ملے
کب کوئی پہلے کا ساتھی کب آگے ملنے والا ہے

حسنِ دنیا دار کہاں اور عشقِ سادہ لوح کہاں
ہم نے رفتہ رفتہ اُس کو اپنے رنگ پہ ڈھالا ہے

سبھی یہاں درویش بنے ہیں گیان دھیان میں ہیں مشغول
سب کی آنکھیں بند ہیں پیارے سب کے منہ پر تالا ہے

دعویدار بہت تھے لیکن کوُچ سمے یہ حال ہوا
جس سے پوچھو یہی پکارے ساتھی پاؤں میں چھالا ہے

مدّتیں گزریں زمانے ہو گئے
اَب وُہ سب قصّے فسانے ہو گئے

خود فریبی

تم اک سادہ سی لڑکی تھیں
جو لان کے سبزہ پر بیٹھی
کچھ اُلٹی سیدھی باتوں میں
لمحوں کو گوندھا کرتی تھی
دھیما دھیما سا لہجہ تھا

کبھی ہلکی بونداباندی میں
اک مُولسری کے پیڑ تلے
ہم بیٹھ کے باتیں کرتے تھے
تم تھوڑے بھیگے بالوں کو
یوں کھول کے جھٹکا دیتی تھیں

مَیں بے بارش کی بوندوں کے
رنگوں میں نہاسا جاتا تھا
تم کیا جانے کیا کہتی تھیں
مَیں کیا جانے کیا سنتا تھا
پَر دونوں ہنسنے لگتے تھے
اور دُور افق کی باہوں میں
رنگین دھنک کِھل اُٹھتی تھی

پھر وقت کے ظالم ہاتھوں نے
تمہیں طوق پنہایا سونے کا
مَیں پھُول جو چُن کر لایا تھا،
وہ ہار گلے کا بَن نہ سکے

اَب آج اچانک محفل میں
جَب مَیں نے تم کو دیکھا ہے
تم شوخ لباس میں بیٹھی ہو
ہاتھوں میں سلگتی سگرٹ ہے
ہونٹوں پہ بَلا کی سُرخی ہے
ہر بات پہ ایسے ہنستی ہو
گویا کہ بہت دل شاد ہو تم
لیکن مجھے ایسا لگتا ہے
تم خود کو دھوکا دیتی ہو
تم خود کو دھوکا دیتی ہو

○

حُسن مختار سہی عشق بھی مجبور نہیں
یہ جفاؤں پہ جفا اب مجھے منظور نہیں

زلف زنجیر سہی دل بھی گرفتار مگر
میں ترے حلقۂ آداب کا محصُور نہیں

دل کا سودا ہے جو پٹ جائے تو بہتر ورنہ
میں بھی مجبور نہیں آپ بھی مجبور نہیں

دامنِ دل سے یہ بے گانہ روی اتنا گریز
تم تو اک پھول ہو کانٹوں کا بھی دستور نہیں

چند جام اور کہ میخانۂ جاں تک پہنچیں
ڈھونڈنے والے مجھے مجھ سے بہت دُور نہیں

سب لباسوں میں ہیں پوشیدہ گناہوں کی طرح
دلِ بے باک بھی محفل کے تئیں عور نہیں

ہر سخن ہوش کا ہے مفتیِ حیران کے ساتھ
سب پیئے بیٹھے ہیں اور کوئی بھی مخمور نہیں

سب رسن بستۂ آزادیٔ ایمان ہوئے
اب کوئی میرے سوا بندۂ مجبور نہیں

اُس سے مل کر بھی اداس اُس کی جدائی بھی گراں
دل بہر حال کسی طور بھی مسرور نہیں

○

اُس لب پہ تبسّم دلِ ناکام بہت ہے
وہ کچھ نہ کہے اتنا ہی پیغام بہت ہے

اُن آنکھوں سے پی لینے کا انعام بہت ہے
کم کم ہی سہی بادۂ گلفام بہت ہے

تسلیم کہ اظہارِ محبت بھی ہے اک جرم
کیا کہیئے کہ یہ جرم مگر عام بہت ہے

قربت تو بڑی چیز ہے اے جانِ تمنّا
اس دل کی تسلّی کو ترا نام بہت ہے

منزل تو نہ تھی دُور مگر پائے شکستہ
شاید ابھی سودائے طلب خام بہت ہے

تم مانو نہ مانو یہ اُسے پیار ہے تم سے
وہ عابدِ وارفتہ جو بدنام بہت ہے
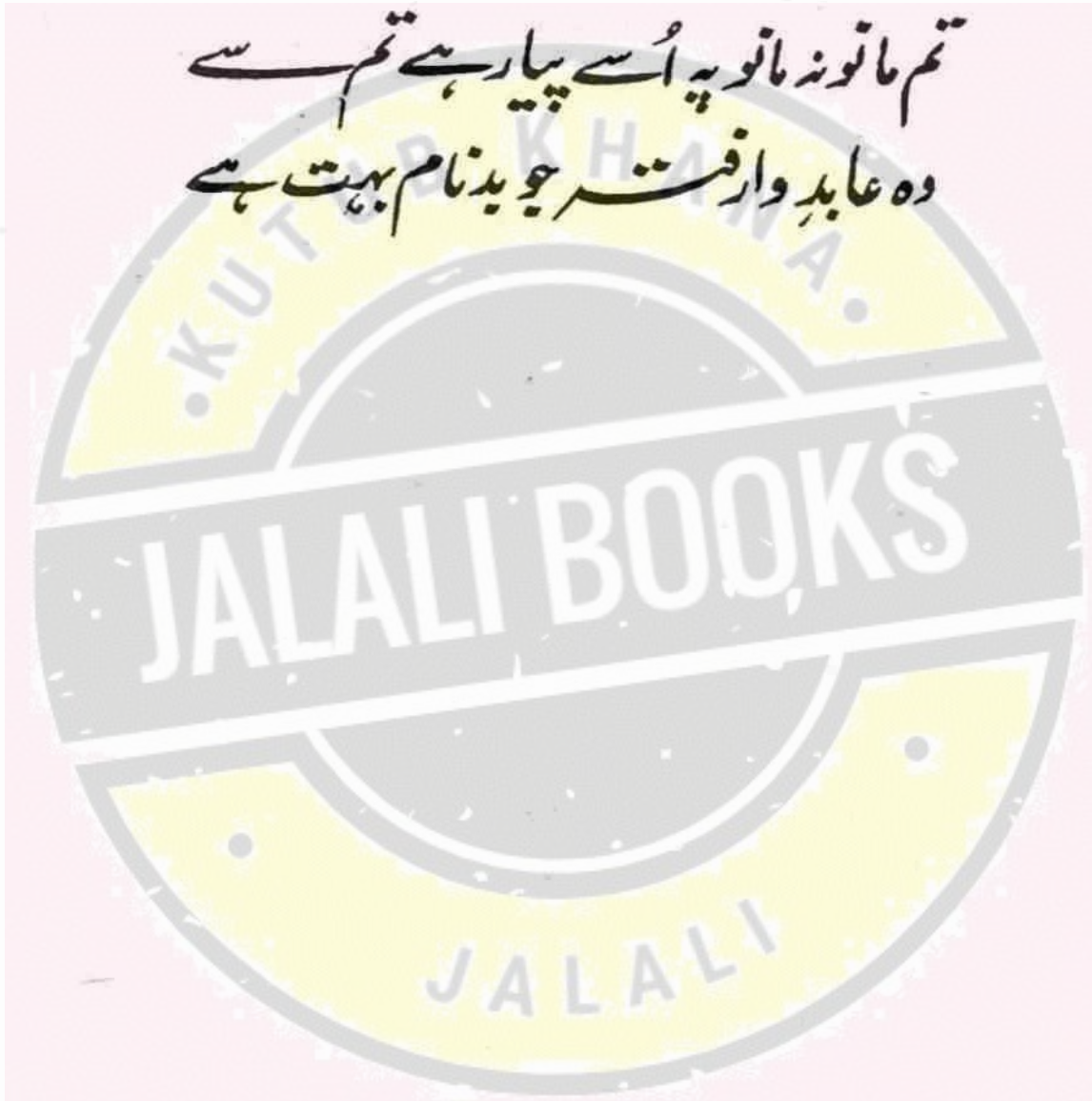
سبھی حسین مرے شہرِ جاں میں بستے ہیں
مَیں اپنے شہر کے لوگوں سے پیار کرتا ہوں

سازِ شکستہ

اے گُلِ نو بہارِ ناز اے کاش
میری جانب بھی ہو نگاہِ کرم!!

مَیں ہوں اِک دامنِ تہی آغوش
مَیں ہوں اک بے نوا شکستہ رغم

مَیں ہوں جس طرح برگِ آوارہ
مَیں ہوں جیسے گُلے بزیرِ قدم

شاہراہِ حیات پر تنہا
مَیں ہوں اور استغاثۂ پیہم

المدد اے شہیدِ ساغرِ سم
الغیاث اے ذبیحِ تیغِ ستم

بار ہے مجھ پہ شرحِ کُن فیکُوں
زندگی ہے فسانۂ مبہم

کون خالق ہے کیسی خلّاقی
مَن زِ آشوبِ ہر گماں رستم

قہر ہے قہر زندگی کہ جسے
لوگ سمجھے ہیں ایک خوانِ نعم

زہر ہے زہر بادۂ انگور
لوگ کہتے ہیں جس کو قاتلِ غم

کون ہے جس کو جانیے اپنا
کون ہے جس کی بات کا ہو غم

اجنبی لوگ اجنبی باتیں
اجنبی طرزِ گفتگو ہے ستم

میں ہوں تنہا خود اپنے دل کی صدا
مجھ سے کیوں لوگ ہو گئے برہم

کیا ستم ہے کہ سوچنا ہے بڑا
کیا غضب ہے کہ بولنا ہے ستم

باہمہ وصفِ نغمہ و آہنگ
سازِ بشکستہ اند اہلِ قلم

ایں چہ رمزیست من نمی فہمم
ایں چہ طرزیست من نمی دانم

انصار بھائی کی یاد میں

نہ مِل سکے گا کبھی یوں جُدا ہوا ہے کوئی
عَدَم کی راہ پہ تنہا چلا گیا ہے کوئی

یہ نیند کتنی ہی گہری ہو دُوسروں کے لئے
مرے خیال کی محفل میں جاگتا ہے کوئی

مگر کہاں کہ اُسی کی ہے گفتگو ہر دم
ہزار بزم سے اُٹھ کر چلا گیا ہے کوئی

کبھی کبھی تو یہاں تک ہوا مجھے محسوس
کہ جیسے میرے برابر میں چل رہا ہے کوئی

ے انصار بھائی مرحوم جن کی محبتوں اور شفقتوں کی یاد آج بھی میرے لیے سرمایۂ جاں ہے۔

سماعتوں نے مرا اِس قدر تو ساتھ دیا
کہیں قریب سے جیسے پکارتا ہے کوئی

لبوں نے جب بھی کئے ہیں جُدائیوں کے گِلے
بصارتوں نے یہ دیکھا اُداس سا ہے کوئی

میں زخم زخم ہوں تنہائیوں کا عالَم ہے
یہ کیا بتاؤں کہ کیوں یاد آرہا ہے کوئی

نسیمِ صُبح کے دامن میں بُوئے پیراہن
گلوں کے رُوپ میں کیسا مہک اُٹھا ہے کوئی

یہ بے نیاز زمانہ وہ اک دلِ حسّاس
خود اپنے شعلۂ سوزاں سے جل بُجھا ہے کوئی

وہ شفقتوں کی گھنی چھاؤں اب کہاں کہ حسَن
مثالِ سایۂ ابرِ رواں ہُوا ہے کوئی

○

شکستگی کا عجب ایک سلسلہ ہے یہاں
مجھے مکان بھی ٹوٹا ہوا ملا ہے یہاں

سنوارنے میں تراشا گیا ہے اُس کو بھی
کبھی جو کوئی نیا پیرہن سِلا ہے یہاں

جو لا کے روز مرے گھر پہ ڈالتا ہے مجھے
وہ راستہ بھی شکستہ بدن ملا ہے یہاں

نسیم سبز قبا چاک کر گئی ہے سحر
کلی کا خون ہُوا ہے تو گُل کھِلا ہے یہاں

سبھی کی آنکھوں میں مجبوریوں کے حلقے ہیں
کسی سے ذکرِ تمنّا بھی اک گِلہ ہے یہاں

مگر یہی کہ ہر اک آدمی فرشتہ ہے
مجھے کِسی سے بھلا کون سا گِلہ ہے یہاں
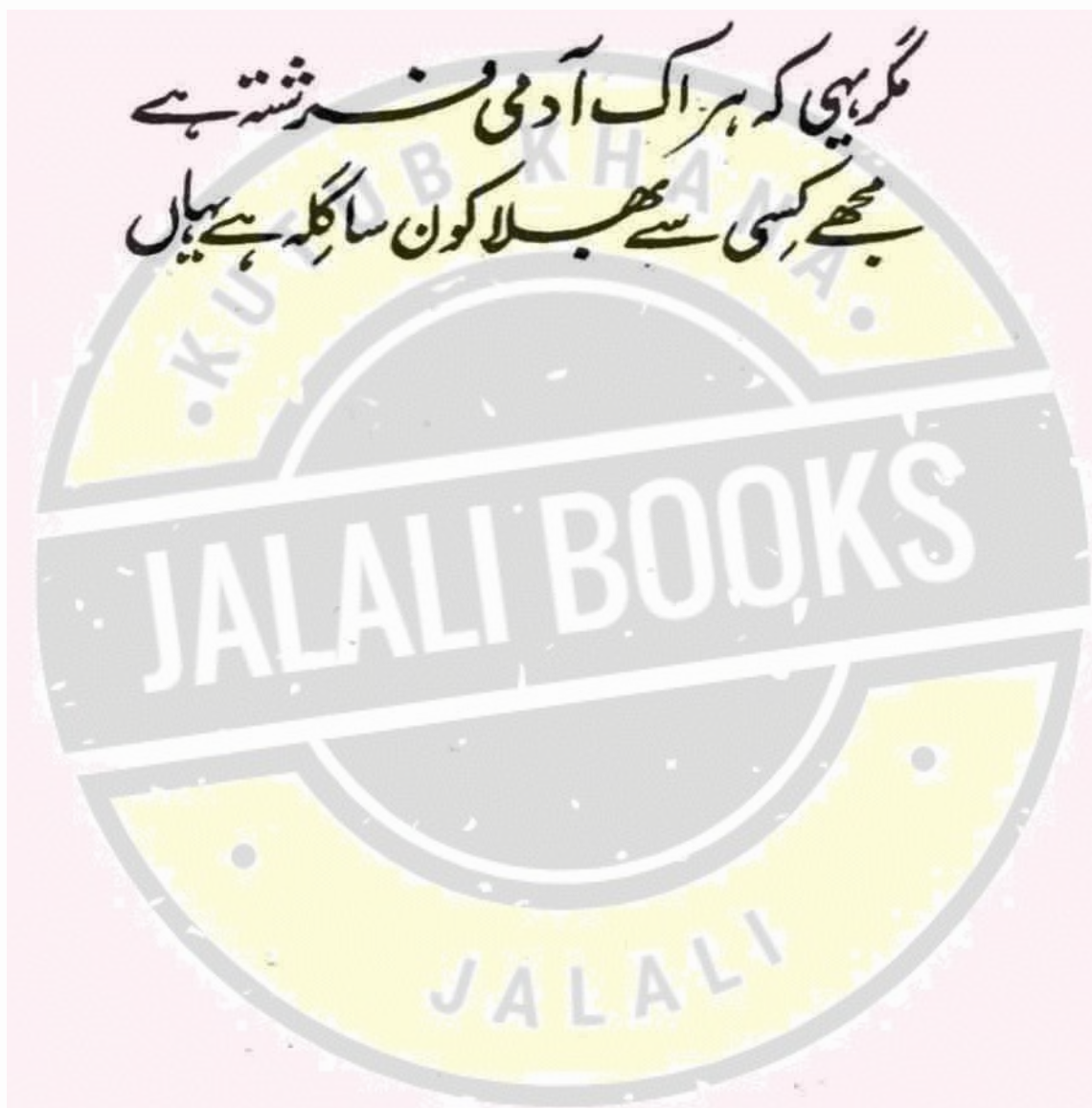
یہ بھی اک شکل ہے فراغت کی
لوگ خاموشیوں پہ مائل ہیں

بیادِ ظفرؔ

دلوں میں ہجر کے کانٹے چبھو گیا ہے کوئی
کسے بتائیں کہاں جا کے سو گیا ہے کوئی

مَیں اُس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں پاگلوں کی طرح
یہیں کہیں اِنھیں راہوں میں کھو گیا ہے کوئی

ہماری آنکھوں کو محروم کر کے نیندوں سے
سکونِ جاں کی صِفَت خواب ہو گیا ہے کوئی

نہ راستہ کا پتہ ہے نہ منزلوں کی خبر
دھوئیں کی شکل ہواؤں میں کھو گیا ہے کوئی

ؔ ظفر مہدی میرا دوست اور عزیز جو اچانک ایک حادثے کی نذر ہو گیا۔

رفاقتوں کا یہ تحفہ تمام عمر کا ہے
پلک پلک مری موتی پرو گیا ہے کوئی

ق

وہ رنگ رنگ تھا اپنے سخن کے گلشن میں
جو چُپ ہوا ہے تو بے رنگ ہو گیا ہے کوئی

یہ بات کیسے حسنؔ جا کے اُس کو سمجھائے
کہ بے نشان زمانوں میں کھو گیا ہے کوئی

بیجوں موج

جب صُبح ہوئی

منہ دھو ڈالا

کسی پارک میں جا کر نلکے سے

جب شام ہوئی

تو چپکے سے

در آئے کسی میخانے میں

جب رات ہوئی

تو آہستہ

منہ ڈھانپ کے سو رہنے کی ادا

یا دو کانوں کے تختوں پر

---

۵ اپنے دوست سدا سرن مسرا کی وفات پر

یا

یاروں کے کاشانوں پر

جاڑوں کی ٹھنڈی شاموں کو

صرف ایک قمیص میں آجانا

اور گنج کی لمبی سڑکوں پر

سینہ پر باندھے ہاتھوں کو

تا دیر یونہی ٹہلا کرنا

یا گاہے

کافی ہاؤس میں

کافی کی ایک پیالی پر

گھنٹوں بیٹھے باتیں کرنا

اور دیر تلک ہنستے رہنا

کچھ شعر سُنانا یاروں کے

کچھ میرؔ مجازؔ اور غالبؔ کے

ہ حضرت گنج، لکھنؤ

کچھ دل رکھنا نوخیزوں کے
کچھ خوش قامت محبوبوں کے
اذکار سے دل کو بہلانا
اِن باتوں میں کیا رکھا ہے
یہ ساری باتیں عام سی ہیں

یہ روز و شب کا برنامہ
کب کسی سیاسی پنڈت کا
کب سادھو سنت مہنت کا ہے
کب پیر ولی اور مُلّا کا
کب عالِم فاضِل دانا کا

یہ روز و شب کا برنامہ
اُس جیون موج کا تھا جس نے
اِس بپتا ساگر میں آکر
اِک پریم کی ناؤ سجائی تھی

اک سُندر سپنا دیکھا تھا
جیسے اک جنگل ہرا بھرا
گیتوں نغموں سے گونج رہا

سارے پنچھی بازو والے
آزاد فضا کے متوالے

سب اپنی اپنی بولی پر
جیون کے روپ دکھاتے ہیں
کچھ "بھیج نبی جی" پڑھتے ہیں
کچھ بھور سمے گنگا تٹ پر
"ہری اوم کرشنا" بھجتے ہیں
کچھ نانک جی کی بانی پر
"وہ گرو" کی مالا جپتے ہیں

پھر ہرے بھرے میدانوں میں
مستی سے راگ اُڑاتے ہیں

کومل دھرتی کے سینہ پر
ابھرے ہوئے رس کے گچھوں سے
امرت جل کھینچ کے لاتے ہیں
پیتے ہیں اور پلاتے ہیں
بل کھاتے ہیں لہراتے ہیں
جیون کا رنگ بڑھاتے ہیں
سب مل کر گانا گاتے ہیں
سب مل کر ہنستے جاتے ہیں
سب مل کر اشک بہاتے ہیں

لیکن یہ سپنا سپنا تھا
اس جیون موج کی سوچوں کا
جو اس بپتا کے ساگر میں
خود ایک مہان کلپنا تھا
اک سندر سندر سپنا تھا

..... اور کیا ملا

آشفتگیِ جاں کے سوا اور کیا ملا
تجھ سے بچھڑ کے جانِ وفا اور کیا ملا

اک رنگ تھا کہ جس میں نہاتے ہوئے تھے ہم
یہ رنگ جب چھٹا تو بھلا اور کیا ملا

بے شہر ہو کے سلسلہ دارانِ عشق کو
صحرا نوردیوں کے سوا اور کیا ملا

جب تیری شاخِ جاں سے اُڑے طائرانِ شوق
لا انتہا خلا کے سوا اور کیا ملا

ہ شارب لکھنوی کے ایک خط کے جواب میں

چہرے تھے کچھ جو خواب کے پردوں پہ جم گئے
ساکت مجسّموں کے سوا اور کیا ملا

اب کیا بتائیں حاصلِ عمرِ سفر شِکار
اک درد تھا جو دل کو ملا اور کیا ملا

کچھ واہمے تھے ذہن میں جو دُور ہو گئے
کیا پُوچھتے ہو ہم سے اداؔ اور کیا ملا

ادا سندھی زبان میں بھائی کو کہتے ہیں

کیوں کہیں

ذرّۂ تیرہ کو ہم لولوئے تاباں کیوں کہیں
پتھّروں کو جوہری لعلِ بدخشاں کیوں کہیں

جب چمن کی ہر روِش پر خاک اُڑتی ہو تو پھر!
خار کو گُل، برگِ سوزاں کو گلستاں کیوں کہیں

ایک زاغِ بدنوا کو خوش نوایانِ چمن،
طوطیِ شکّر مقالِ گلعذاراں کیوں کہیں

کیوں نہ پھینکیں نوچ کر ان کی نقابیں زیرِ پا
زشت رویانِ چمن کو ماہِ کنعاں کیوں کہیں

جس کے بامِ فکر پر ہو آشیانہ بُوم کا
اہلِ دانش پھر اُسے دانائے دوراں کیوں کہیں

جس کا نشترِ قوم کی شہ رگ میں ہو پیوست اُسے
اہلِ دل اہلِ نظر عیسیٔ دوراں کیوں کہیں

جب خرِ عیسیٰ چلا آئے کتابیں لاد کر
لوگ اُسے مفتیٔ عصر و شیخِ دوراں کیوں کہیں

مُخبرانِ ہرزہ گو پر شاہ کو ہے اعتبار
پھر یہ حضرت اہلِ حق کو حق بداماں کیوں کہیں

قطع کر ڈالا گیا نوشیروانی باغِ داد
شاہ کو اب حامیٔ انصاف و ایماں کیوں کہیں

دینِ مُلّا ہے فساد، اقبال فرماتے ہیں جب
پھر کسی مُلّا کے دیں کو اصلِ ایماں کیوں کہیں

زِشت کاری کو بھلا کارِ حسن سمجھیں تو کیوں!
عابدِ تیرہ عمل کو نیک انساں کیوں کہیں

روایت

ہوا تیز تھی

آسمان پر ابر کے دو ٹکڑے لپکتے ہوئے چلے جا رہے تھے

اچانک

ایک نے ایک سے سوال کیا

ہم کہاں جا رہے ہیں؟

مُکلّف جواب ابر پارے نے بُوند بُوند ٹپکنا شروع کیا

اور غائب ہو گیا

مُدتوں کی پیاسی زمین سیراب ہو چکی تھی

ہر طرف جل تھل تھا

لوگ اپنے سروں پر چھتریاں تان کر نکل کھڑے ہُوئے

میدانوں میں دُھلے ہوئے نرم کنچن جیسے سبزے پر

خون کے سُرخ سُرخ قطرے رینگنے لگے
اور پھر
کھیت کے بیچوں بیچ
گیہوں کے دو دانوں نے اپنے سَروں سے مٹی کا بوجھ اتارا
انگڑائی لی
اور بھیگی بھیگی نرم ہوا کا رس چوس کر
تھکن دُور کرنے لگے

اچانک
دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا
اور
ایک نے ایک سے سوال کیا
ہم کون ہیں ؟

ہوا کی سَرسَراہٹوں کے درمیان
جواب دینے والے نے جواب دیا
"وجودِ غائب کا زندہ رشتہ"

دونوں کے پپوٹوں کو جنبش ہوئی
اور باچھیں کھِل اٹھیں

اوپر
لکّہ ہائے ابر کی سیاہ چھتریاں غائب ہو چکی تھیں
اور دُھلی دُھلی فضا میں
نیلا شفّاف آسمان
صاف نظر آرہا تھا

اَب کے بہار میں یہ عجب طرح نو پڑی !
پھُولوں کے چاک چاک گریباں نہ ہو سکے

○

فروغِ نشّہ ہے فکرِ شکستِ جام نہیں
جنوں کو مصلحت اندیشیوں سے کام نہیں

بھرے ہیں جام کسی پر کسی کا نام نہیں
یہ میکدہ ہے یہاں فرقِ خاص و عام نہیں

جفا کے ذکر پہ تم کیوں ہوئے ہو چیں بہ جبیں
تمھاری بات نہیں ہے تمھارا نام نہیں

بِکے ہوئے ہیں شب و روز غیر کے ہاتھوں
ہماری صبح نہیں ہے ہماری شام نہیں

○

اُس کی باتیں جو سنیں خود سے پشیمان ہوئے
اُس کو دیکھا تو سبھی صاحبِ ایمان ہوئے

وہ کسی اور کا ہے سُن کے یہ حیران ہوئے
آج ہم اُس کے لیے دل سے پریشان ہوئے

سر چھپانے کے لئے سایۂ دَر ہے درکار
لوگ کہہ کہہ کے بھی صاحبِ ایوان ہوئے

سوئیاں چبھنے لگیں سارے بدن میں جیسے
میری باتوں سے بہت لوگ پشیمان ہوئے

ایک وقت ایسا بھی آیا اِسی سُورج کے تلے
جاننے والے مجھے جان کے انجان ہوتے

تیز تھی مَوجِ ہوا رِشتۂ جاں سرد ہوا
شاخ سے ٹوٹ کے گُل خاک کے مہمان ہوئے
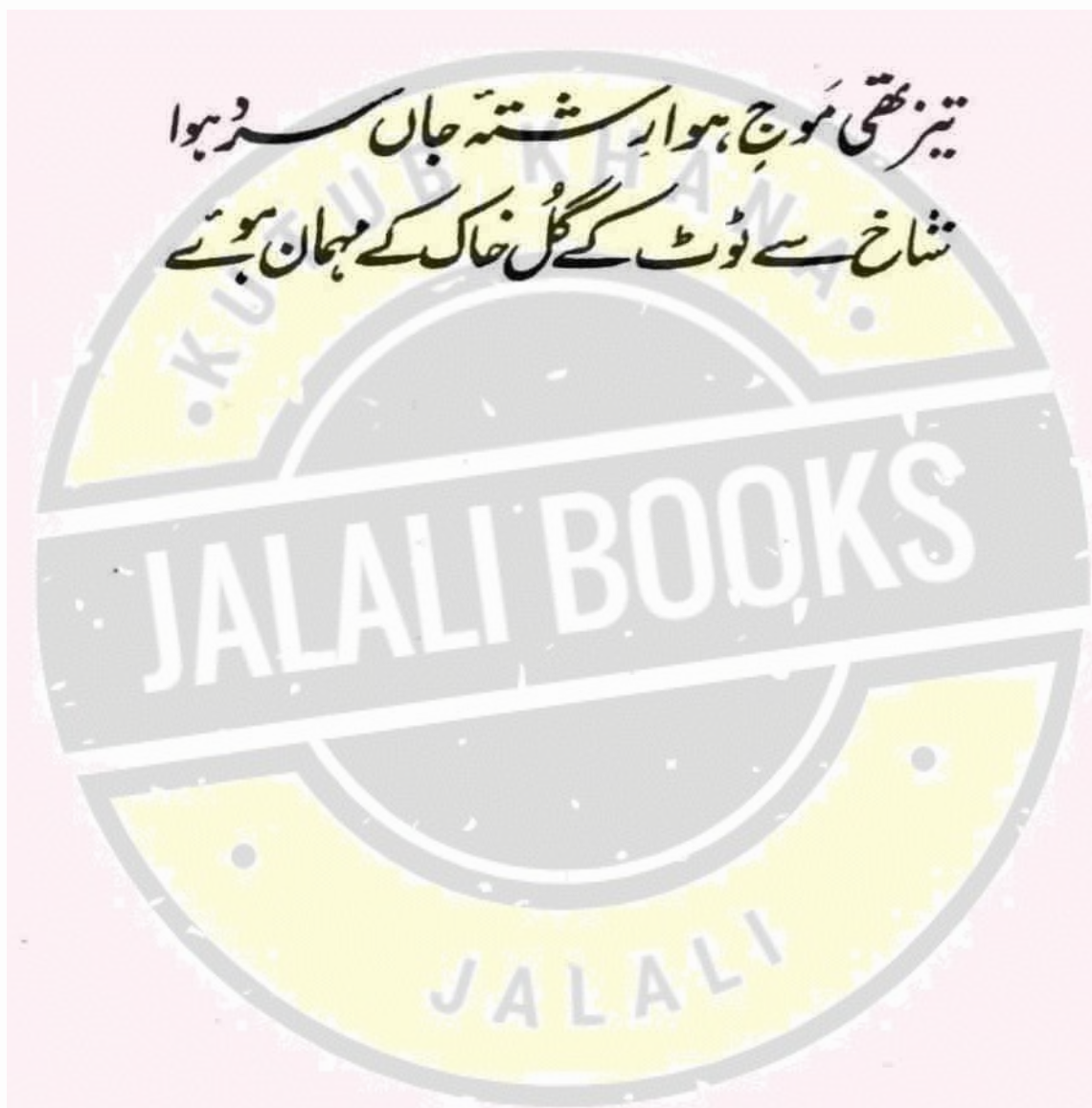
یہ مُردے ہیں جو سڑکوں پر رواں ہیں
یہاں جیتے ہوئے انساں کہاں ہیں

خود تنقیدی

مَیں نئے موسموں کا شاعر ہوں

اور میرے نگار خانے میں

زرد پتّے بجھی ہوئی شمعیں

کچھ شکستوں سے چُور آئینے

ٹیڑھے میڑھے خطوط چہروں کے

کِرم خوردہ کیلنڈروں کے نشاں

تا بداں پر تنے ہوئے جالے

گردِ وحشت بچھی ہُوئی ہر سُو

فرشِ غم پر دراز سنّاٹے

بے حسی کے ستوں سے لپٹی ہوئی

بے ضمیری کی مکڑیاں کالی!

ایک چہرہ ہے جس کے اتنے رُوپ

کس قدر تیز جنگ جاری ہے
ہر طرف ہے دُھویں کا ابرِ محیط
خون کی چادریں سی اُڑتی ہیں
بوڑھے بچے جوان مرد و زن
سر ہتھیلی پہ رکھ کے نکلے ہیں
سب کے چہروں پہ عزم کی سرخی
اور دشمن کی کوششیں ہیں یہی
سرخ چہرے خزاں زدہ ہو کر
گھلتی شمعوں کی طرح کھو جائیں
نا امیدی کے غار میں تھک کر
بچے بوڑھے جوان سو جائیں
کھیت ہو جائیں روشنی کی صفیں!

میں بھی شاعر ہوں
میری خواہش ہے

میں بھی اپنی صفیں دُرست کروں
تیرگی سے مقابلہ کے لئے
آخری بار فیصلہ کے لئے
ایک معجز نما جہاد کروں

لیک
میرے نگار خانے میں
زَرد پتّے ہیں
زَرد چہرے ہیں
زَرد رنگوں کا زرد موسم ہے
دَست و پا ہیں خزاں زدہ شاخیں
ذہن و دل ہیں بجھی ہوئی شمعیں
میں نئے موسموں کا شاعر ہوں

○

ہے ہوا تیز اڑیں گے پتّے
شاخ سے ٹوٹ کے بکھرے پتّے

جب بھی آئی کسی آنگن وُہ ہوا
آئے گردش میں وہاں کے پتّے

قید کر لے گئی زنجیرِ صبا
جب کبھی پیڑ سے اُترے پتّے

دوپہر، دھوپ، خزاں کی آنچیں
بن گئے آگ کے شعلے پتّے

ہم نے ایسے بھی شجر دیکھے ہیں
خود شجر جھوٹ ہیں جھوٹے پتّے

آگ دے دو تو جلا دیں جنگل
سُوکھے سُوکھے سے یہ پیلے پتّے

شام آئی تو گھروں سے اپنے
ہو کے آراستہ نکلے پتّے

پیڑ پر کیسے سجے تھے کل تک
آج گلیوں میں ہیں بکھرے پتّے

باہری دھوپ نے مرجھا ڈالا
گھر سے نکلے تو ہرے تھے پتّے

کام کرنا تھا انوکھا کوئی!!
جسم پر ہم نے اُگائے پتّے

○

کس طرح کے ہیں غم میں تمھیں بتاؤں کیا
جو دل پہ زخم لگے ہیں انھیں دکھاؤں کیا

سماعتیں بھی ہوئیں بدگمانیوں کی اسیر
عجب ہیں درد کے قصّے مگر سناؤں کیا

وہ ایک شخص مجھے اب بھی یاد آتا ہے
جو دل میں درد اٹھے ہیں وہ بھول جاؤں کیا

وہی ہے سنتِ نمک پاش و دستِ چارہ گر
ہیں زخم زخم سہی حالِ دل دکھاؤں کیا

وہ بھی خفیف نہ ہو چارہ جو مریضوں میں،
مسیحِ درد سے پوچھو کہ میں اُٹھ آؤں کیا

جو چارہ ساز تغافل سے کام لے تو پھر
کوئی بتاؤ اُسے دردِ دل سناؤں کیا
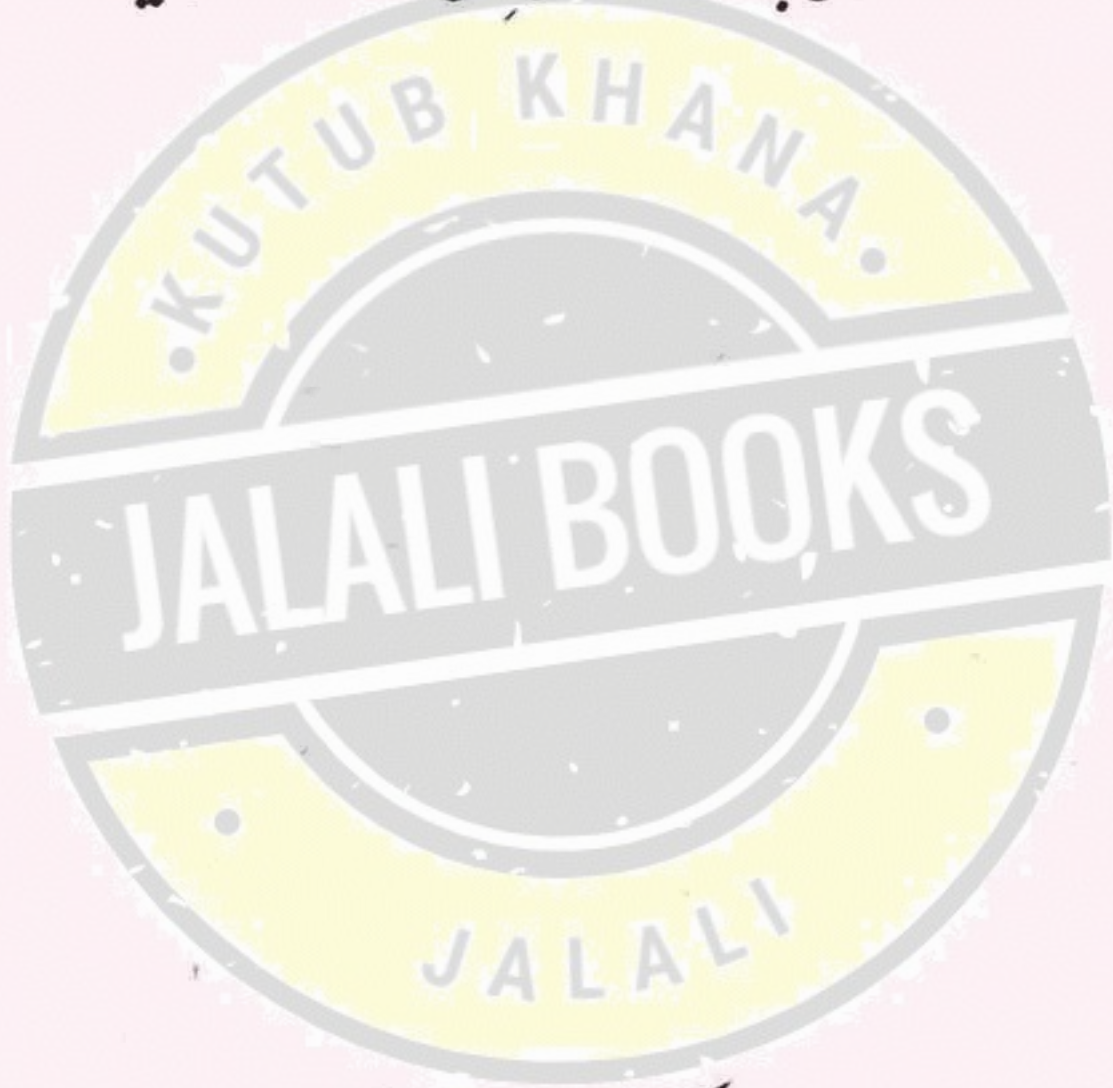
اُس میں کچھ ہے جو بس اُسی میں ہے
ہم تو کیا سب اُسی کے گھائل ہیں

جاگتا پانی

(ریڈیو پر عظیم رہنما ماؤزے تنگ کے انتقال کی خبر سن کر)

لہروں نے اک رنج سُنایا

تند اور تیز رو، بیاکُل دریا ——— نیل گگن سا

بہتے بہتے

آج کسی پل سوکھ گیا ہے

لہروں نے اک دکھ پھیلایا

ہر دل سے ہر دل نے درد اگایا

یہ دریا سچّا دریا تھا

اس دریا کا جاگتا پانی ——— گہرا پانی

ذہنوں میں پوشیدہ چٹانیں ——— توڑ چکا ہے

توڑ رہا ہے

پتھریلے اوہام کے پربت کاٹ چکا ہے

کاٹ رہا ہے

اس دریا کی روشن نہریں
کاہکشاں کا جال بچھائیں
جنم جنم کی بھوک اور پیتا
بیماری اور کال کی چنتا
زنجیروں میں جکڑی جائے
آخر افسانہ بن جائے

اوپر بیٹھا بوڑھا تاؤ
دیکھے اور پلکیں جھپکائے

اِن روشن نہروں کا پانی —— اُجّل ہانی
اپنے اپنے دیس کے آنگن کی مٹی کو نرماہٹ دے

یہ نرماہٹ
آرزوؤں کی سوندھی خوشبو

چاندی چاول سونا گیہوں
انگوروں کی بیل کا جادو
سارے آنگن میں پھیلائے
دھرتی ماں کی گود سجائے
نئی سحر کی جوت جگائے

جوت

جو اس پانی کا پھل ہے
یہ پانی ہے سچّا پانی
یہ پانی کیسے سوکھے گا
یہ پانی تو ابر بنے گا
ابر جو صدیوں تک برسے گا

سچّا ایمان

ہم جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں
ہم سچے ہیں
سچّائی ہمارے سینوں میں
ایمان کی صورت روشن ہے
ایمان ہمارا محنت پر
اور محنت کی حقداری پر
جو محنت کرنے والے ہیں
اُن کا بھی حق آزادی ہے
یہ راگ ہمارے سینوں میں
سانسوں کی طرح لہراتا ہے
ایمان کی صورت پلتا ہے
یہ پلتا ہے اور بڑھتا ہے

یہ بڑھتا ہے اور پھیلتا ہے
اِک نُور کے ہالے کی صُورت

اور اک دن ایسا آئے گا جب
اِس بڑھتے پھیلتے ہالے میں
دھرتی کے سارے محنت کش
سب علم کے پیاسے شوخ جواں
سب اہلِ قلم سب دانش ور
سب اہلِ ہُنر سب اہلِ ادب
سب ساتھی سچی باتوں کے
حلقہ در حلقہ آئیں گے
صف بستہ ہو کر پھیلیں گے
اور اپنے خاص محاذوں سے
صف آرا ہو کر پھینکیں گے
لفظوں کے دہکتے انگارے

تحریر کے زہر آگیں نیزے
جملوں کی لچکتی تلواریں
سَر تن سے جُدا کر ڈالیں گی
شیطان کی اندھی فوجوں کے
شیطان جو اپنی بغلوں میں
ماضی کے پٹارے کے اندر
زہریلے سانپ چھپائے ہے
جو سازش کی تاریکی میں
باھر آکر لہراتے ہیں
کچھ طاقت وَر ہو جاتے ہیں
پھر اپنے تھوک کے چھینٹوں کو
چاروں جانب پھیلاتے ہیں
اور روشنیوں کی شمعوں کو
پھُونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں
پَر ناکامی کی صُورت میں

جَل جَل کے بھَسَم ہو جاتے ہیں
پھر وُہ دِن بھی آ جاتا ہے

جَب سات سمندر کی سانسیں
بادل بن کر چھا جاتی ہیں
محبُوب کی زلفوں کی صُورت
بَل کھاتی ہیں لہراتی ہیں
اور اِن سے موتی گِرتے ہیں
چمکیلے نوُر کے ٹکڑوں سے
یا جَیسے محنت کے تن پَر
بوندیں شفّاف پسینے کی
یا جَیسے کوئی سیم بدن!
وصل محبوُب کی محنت سے
لگتا ہو نہا کر نکلا ہے
اور جس کے چاندی سے تَن پر

قطروں کی ننھی کرنیں سی
بیٹھی آنکھیں چمکاتی ہوں
ہلکے ہلکے مُسکاتی ہوں
جو بات نہیں ہے کہنے والی
وہ بات بھی کہتی جاتی ہوں
پھر اِن چمکیلے قطروں سے

تاریکی سب چھٹ جاتی ہے
برسوں کی پیاسی یہ مٹّی
سینے کی آگ بجھاتی ہے
ہر جانب نور برستا ہے
دھرتی کے کومل سینے میں
نورانی نہریں بہتی ہیں
سب محنت کش سب شوخ جواں
سب سچّے بیٹے دھرتی کے

جیون کا سوگ بڑھاتے ہیں
اور دھرتی ماں کے چرنوں میں
آشا کے پھول چڑھاتے ہیں
پھر اپنے پربل ہاتھوں کو
اک ساتھ اُٹھا کر گاتے ہیں
ہم سچے ہیں

سچائی ہمارے سینوں میں
ایمان کی صورت روشن ہے
ایمان ہمارا محنت پر
اور محنت کی حقداری پر
ہم سچے ہیں ہم سچے ہیں
ہم جھوٹ سے نفرت کرتے ہیں
ہم سچے ہیں

○

یہ نگری دکھ کی نگری ہے، پر کوئی کہو ہم جائیں کہاں
دکھ چاروں کھونٹ براج رہے سکھ شہر کا رستہ پائیں کہاں

اک بات جو اُس سے کہنی ہے وہ بات ہے مَن کی بھید بھری
پر جو گِرد کھڑے ہیں کان مگر یہ بات اُسے بتلائیں کہاں

کچھ سنگی ساتھی کہتے ہیں چُپ سائے تلے آرام کرو
باہر ہے دھوپ کڑی دیکھو ایسے میں نکل کے جائیں کہاں

وہ کوچہ تو برباد ہوا جو اُس گھر کو لے جاتا تھا
ہم ایسے پَت جھڑ موسم میں اب آخر خاک اڑائیں کہاں

میں اِن بگڑوں سے کہتا ہوں کہ کوہ جو حائل راہ میں ہے
ہم اس پر ضرب نہ ماریں تو یہ تیشۂ جاں لے جائیں کہاں

کچھ پتھر ٹوٹ گریں گے ہی کچھ رات کا سینہ شق ہو گا
یہ وقت جو ہم پر آن پڑا اس وقت کا غم بہلائیں کہاں

بجا بجا یہ تکلّف یہ اہتمام درست
خلوصِ دل کی مگر اور بات ہے پیارے

کربلا

کربلا میرے بڑوں کی محنت
میرے آبا، مرے جد کی زحمت
کربلا میرے بڑوں کی عظمت

کربلا میرا نشاں میرا اثاثہ میرا گھر
میرے آنگن کا شجر
جس کی شاخوں کے چمک دار ثمر

مجھ میں موجود دمکتا ہوا بے باک لہو
میرے سینہ میں بغاوت کی نمو
دستِ سفاک پہ بے حوصلۂ ضربتِ شعلہ پیکر
نیزۂ خارِ نظر

جس سے ترساں شبِ موجود کے دزدانِ ثمر

یہ مرا نورِ بصر

جس میں عُریاں "سیپۂ شام" کی دیوار کے سارے پتھر

جن کی پیشانی پہ مہرِ اسوَد

جس طرح داغ طویلوں میں لگا دیتے ہیں

کربلا

چشمِ تہذیب سے ٹپکا ہوا اک شعلۂ تر

میری تحریکِ سَحَر کا مصدر

میرا آغازِ سفر

کربلا

جرأتِ انکار کا روشن پیکر

صحنِ تاریخ میں اُبھرا ہوا مینارِ ظفر

سب کا آغازِ سفر

نذرِ حسن ناصر

نگارِ صبح تری آرزو میں کھو یا گیا
وہ شب چراغ جسے تیرگی سے نفرت تھی
وہ ایک حرفِ جنوں جو ادا ہوا سرِ دار
وہ خوش جمال جسے خود کشی سے نفرت تھی

جسے فراق کے لمحے عذاب لگتے تھے
جسے شکستگیِ جسم و جاں سے نفرت تھی
جسے قبول نہ تھی زرد چہرگیِ چمن
جسے تسلطِ دستِ خزاں سے نفرت تھی

جو چاہتا تھا لبِ سرخِ یار کا موسم
جنوں بہ دوش وصالِ بہار کا موسم

دل بہ کفِ منتظرِ روئے بہار اور بھی ہیں
ہم سے دیوانے سرِ راہ گزار اور بھی ہیں

بات جو اُس گلِ رنگیں میں ہے اوروں میں کہاں ہیں
یوں تو پروردۂ آغوشِ بہار اور بھی ہیں

کچھ خبر ہے تجھے اے نکہتِ آوارہ مزاج
تیرے مانند پریشانِ بہار اور بھی ہیں

سرفروشی کوئی منصور پہ موقوف نہیں
جاں نثارانِ رہِ حق سرِ دار اور بھی ہیں

اک فقط میں ہی نہیں کشتۂ غمہائے جہاں
خوبیٔ نظمِ زمانہ کے شکار اور بھی ہیں

مَیں نے جرم کیا ہے کیا لوگو؟

مَیں نے جرم کیا ہے کیا لوگو
کیوں مجھ کو اِس چوراہے پر
اِس طرح برہنہ جسم کیا
مرے ہاتھ بندھے مرے پاؤں بندھے
مری ننگی پیٹھ پہ سُرخ نشاں
مَیں نے جرم کیا ہے کیا لوگو
کیوں مجھ کو اِس چوراہے پر
اِس طرح برہنہ جسم کیا

میں اپنے گھر کی عزت ہوں
مری بیوی شرم و حیا والی
مری بوڑھی ماں سیدھی سادھی

چاہت والی شفقت والی
مرے کچے پکّے آنگن میں
اک گول مٹول سی گڑیا ہے
جو رات گئے مرے سینہ پر
سونے کی عادت رکھتی ہے

مرا غیرت والا بیٹا ہے
مجھے پیار سے بابا کہتا ہے
مرا گبھرو کڑیل شوخ جواں
اِن لوگوں پر کیا گزرے گی
اِن معصوموں کا دوش ہے کیا
کیوں اِن سے جُدائی دیتے ہیں
کیوں اندھے بندی خانوں میں
قیدِ تنہائی دیتے ہیں
تم لوگ بھلا کچھ سوچو تو

کیوں ان کے سر کی چادر کو

یوں لوٹ کے جیبیں بھرتے ہیں

یہ بے غیرت بے شرم و حیا

جو عدل کے پتلے بیٹھے ہیں

انصاف کی اونچی کرسی پر!

ان لوگوں سے کچھ پوچھو تو

کچھ بولو تو

میں نے جرم کیا ہے کیا لوگو

کیوں مجھ کو اس چوراہے پر

اس طرح برہنہ جسم کیا

میں کچھ بھی نہیں تو کم سے کم

اک شہری اپنے دیس کا ہوں

یہ دیس جو میرا اپنا ہے

جواب اک ٹوٹا سپنا ہے

میں نے اس دیس کے چرنوں میں
اک دن یہ سیس نوایا تھا
اور من ہی من میں سوچا تھا
اس دیس کے عُریاں سینے کو
سبزے کی قبا پہنائیں گے
اور اس کے کومل کانوں میں
سونے کی بالی ڈالیں گے
اپنی محنت کے بل بوتے
ست رنگا رُوپ سجائیں گے
پھر فخر سے اونچے سارے سر
اجرک کے صافے باندھیں گے
اور رات گئے چوپالوں میں
سب مل کر بھنگڑا ڈالیں گے
ہنسیوں کی جھانجن باجے گی
گیتوں کے سُر لہرائیں گے

ڈھولک کی اُونچی تھاپوں پر
رنگین بھنور بل کھائیں گے

یہ خواب تو کوئی جرم نہ تھا
پھر ان لوگوں سے پوچھو تو
کچھ بولو تو

میں نے جرم کیا ہے کیا لوگو
کیوں مجھ کو اس چوراہے پر
اس طرح برہنہ جسم کیا

مرے خواب کی ڈالی جب ٹوٹی
پھل میری محنت کے سارے
صحنِ گلشن میں بکھر گئے
کچھ راکھشسوں نے سازش کی
اور پھل چن چن کر لے بھاگے
میں نے جب اِن کو للکارا !!

اور اِن سے اپنا حق مانگا

تو یہ بولے "تم مجرم ہو"

اب سوچو تو

کچھ بولو تو

مَیں نے جرم کیا ہے کیا لوگو

اِن راکھشسوں سے پوچھو تو

کیوں مجھ کو اِس چوراہے پر

اس طرح برہنہ جسم کیا

مرے ہاتھ بندھے مرے پاؤں بندھے

مری ننگی پیٹھ پہ سُرخ نشاں

مرے چاروں سمت دھندلکا ہے

مجھے دھندلا دھندلا لگتا ہے

مرے سَر میں ہے سنّاٹا سا

لیکن یہ اچانک بات ہے کیا

مرے کان نیچے باسٹرکوں پر

ذرا دیکھو تو

یہ شور سا کیسا اُٹھا ہے

یہ نعرے کیسے نعرے ہیں

یہ مجمع کیسا مجمع ہے

کیوں آگے بڑھتا آتا ہے

کیوں راکھشسوں میں بھگدڑ ہے

مجھے دھندلا دھندلا لگتا ہے

یہ آنکھیں ماں کی آنکھیں ہیں

یہ چہرے بہنوں کے چہرے

یہ چوڑے بازو بیٹوں کے

یہ چیخیں میرے بچے ہیں

جو موت سے زیادہ سچے ہیں

یہ سارے میرے اپنے ہیں

اور مستقبل کے سپنے ہیں

یہ میری جانب آتے ہیں

انھیں آنے دو

اِن ہاتھوں میں بندوقیں ہیں
انھیں لانے دو

اِن ہاتھوں میں تلواریں ہیں
انھیں چلنے دو

یہ میری پیٹھ کا مرہم ہیں
یہ میرا لباسِ محرم ہیں
ہم بندی خانے توڑیں گے
ہم ٹوٹے رِشتے جوڑیں گے

یہ میری جانب آتے ہیں
انھیں آنے دو
انھیں لانے دو
انھیں چلنے دو

یہ مجمع میرا مجمع ہے
یہ نعرے میرے نعرے ہیں

پیکار

جو باتیں جھوٹی ہوتی ہیں!

اُن باتوں سے انکار کرو

جو لوگ یہ باتیں کرتے ہیں

اُن لوگوں سے پیکار کرو

پیکار کرو

پیکار کرو

اس نیل گگن کے سائے میں

شیشہ پربت کے پاؤں تلے

سرسبز فضا کے دامن میں

اک چاندی دریا بہتا ہے

دریا کی تہہ میں موتی ہے

یہ موتی محنت والوں کا

یہ موتی ہمّت والوں کا

یہ موتی مال جیالوں کا

ساحل پر بیٹھا بیوپاری
اس موتی کا بیوپار کرے
اِس پار سے لے اُس پار کرے
یہ لے ماری بٹ ماری ہے

بٹ ماروں سے پیکار کرو
لے ماروں سے پیکار کرو
پیکار کرو
پیکار کرو

شہروں سے پرے میدانوں میں
ہریالے بَن لہراتے ہیں
اِن لہروں کے آئینہ میں
سرسوں کے کنول مُسکاتے ہیں
کھیتوں کی ننگی چھاتی پر
اہرام اُگے ہیں سونے کے

یہ سونا محنت والوں کا
یہ سونا ہمّت والوں کا
یہ سونا مال کسانوں کا

کچھ اُونچی اُونچی پَگ والے
جاگیر محل کے ٹھگ سارے
سونے پر ہاتھ بڑھاتے ہیں
اِن ہاتھوں سے

پیکار کرو
پیکار کرو
پیکار کرو

جب کرنیں سیدھی پڑتی ہیں
اور خون پسینہ بنتا ہے
جب آگ سے روشن بھٹی میں
فولاد پگھل کر بہتا ہے
جس طرح شفق کی موجِ رواں
بَل کھاتی ہُوئی لہراتی ہوئی
تپتے ہوئے روشن چہروں کے
ہاتھوں کی ضربیں کھاتی ہوئی

سانچوں میں ڈھلتی جاتی ہے
اور بالآخر بازاروں کی
رونق ہو کر زینت بن کر
سکّہ چاندی کا لاتی ہے

یہ سکّہ محنت والوں کا
یہ سکّہ ہمّت والوں کا
یہ سکّہ سب مزدوروں کا

کچھ کالے دھن کے پونجی پت
بیٹھے ہیں سانپ خزانوں پر
ان سانپوں سے
پیکار کرو
پیکار کرو
پیکار کرو

○

جو نقوش رہ تھے مٹے مٹے انھیں آ کے پھر سے جلا دیا
ترے عکسِ رُخ نے سیاہیِ شبِ غم کا رنگ اڑا دیا

مہِ داغ داغ چمک اُٹھا گلِ زخم زخم مہک اُٹھا
غمِ یار تیری نگاہ نے مجھے دل نواز بنا دیا

مرے پاس تھے یہی جان و دل یہی آج نذرِ وفا کیے
وہ جو فرض تھا وہ ادا ہوا وہ جو قرض تھا وہ چکا دیا

یہی چشم و لب یہی زلف و رُخ کبھی اِن پہ ایسی پھبن نہ تھی
ترے عاشقوں کی بہار ہو تجھے دیکھ کیسا سجا دیا

سرِ دار میرا ہی سر ہے یہ سرِ راہ میرا ہی جسم ہے
مرا قول قولِ حسینؓ تھا جو کہا وہ کر کے دکھا دیا

کھاجا

قطار اندر قطار چینٹے

سیاہ چینٹے

بلوں سے اپنے نکل کے سڑکوں پہ آگئے ہیں

ہر ایک کے ہاتھ میں ہے پرچم

سیاہ پرچم

سیاہ کاندھوں سے اونچے ہوکر

فضاؤں میں پر فشاں ہوئے ہیں

سیہ سڑک پر

صفیں جمی ہیں

میں ایک ٹیلہ پر ایستادہ

برہنہ آنکھوں سے

ایک بڑھتا سیاہ جنگل سا دیکھتا ہوں

سیاہ شاخیں سیاہ بھالے

سیاہ بندوق کی صدائیں

مَیں سُن رہا ہوں

سیاہ نعرے، جو گولیاں بن کے اُڑ رہے ہیں

مَیں دیکھتا ہوں

سیاہ ہاتھوں کی ضربِ پیہم

سیہ طبل کی صدائے دَم دَم

سیاہ جسموں کا رقصِ پیہم

جنونِ آدم

شعورِ برہم

سیہ زمیں کے سیاہ ذرّے

فضا میں اڑتے سیہ شرارے

مَیں دیکھتا ہوں
چہار جانب سیہ دھوئیں کی
سیاہ چادر سی تن گئی ہے

یہ کرۂ ارض
اپنے آفاق کے حوالہ سے
ایک گنبد سا بن گیا ہے
سیاہ گنبد
کہ جس کے اندر
سیاہ جنگل کے بالمقابل
سیہ سڑک پر
سفید ہاتھی، سفید خنزیر
اپنی سونڈ اور اپنے پنجوں کے تازہ زخموں کو چاٹتے ہیں

فرار کی راہ ڈھونڈتے ہیں

مگر یہ بڑھتا سیاہ جنگل

بالآخران کا نصیب ہوگا

نصیبِ تیرہ

سیاہ چینٹوں کا صرف کھاجا